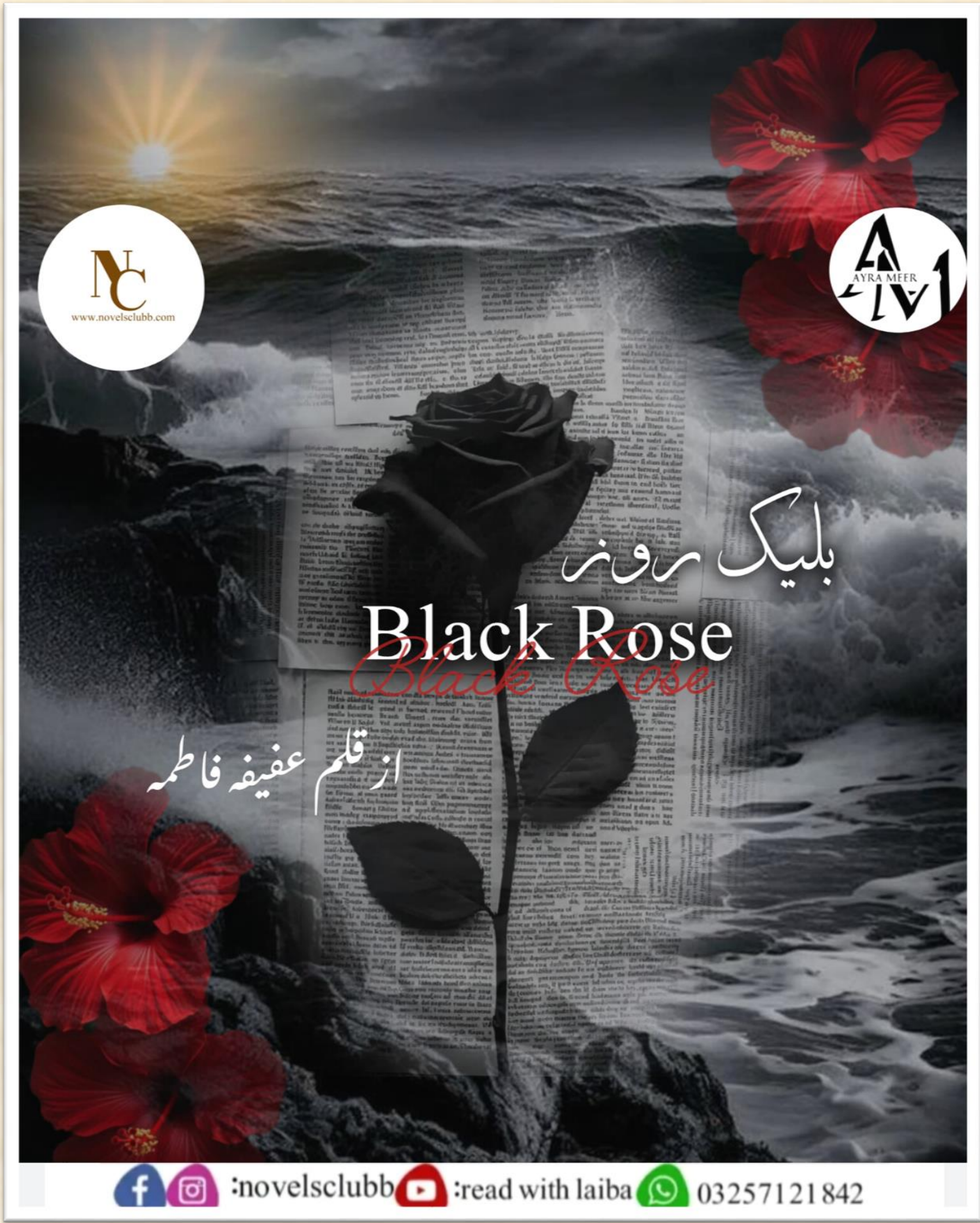
www.novelsclubb.com
AYRA MEER
بلیک روز
Black Rose
Black Rose
از قلم عفیفہ فاطمہ
:novelsclubb
:read with laiba
03257121842

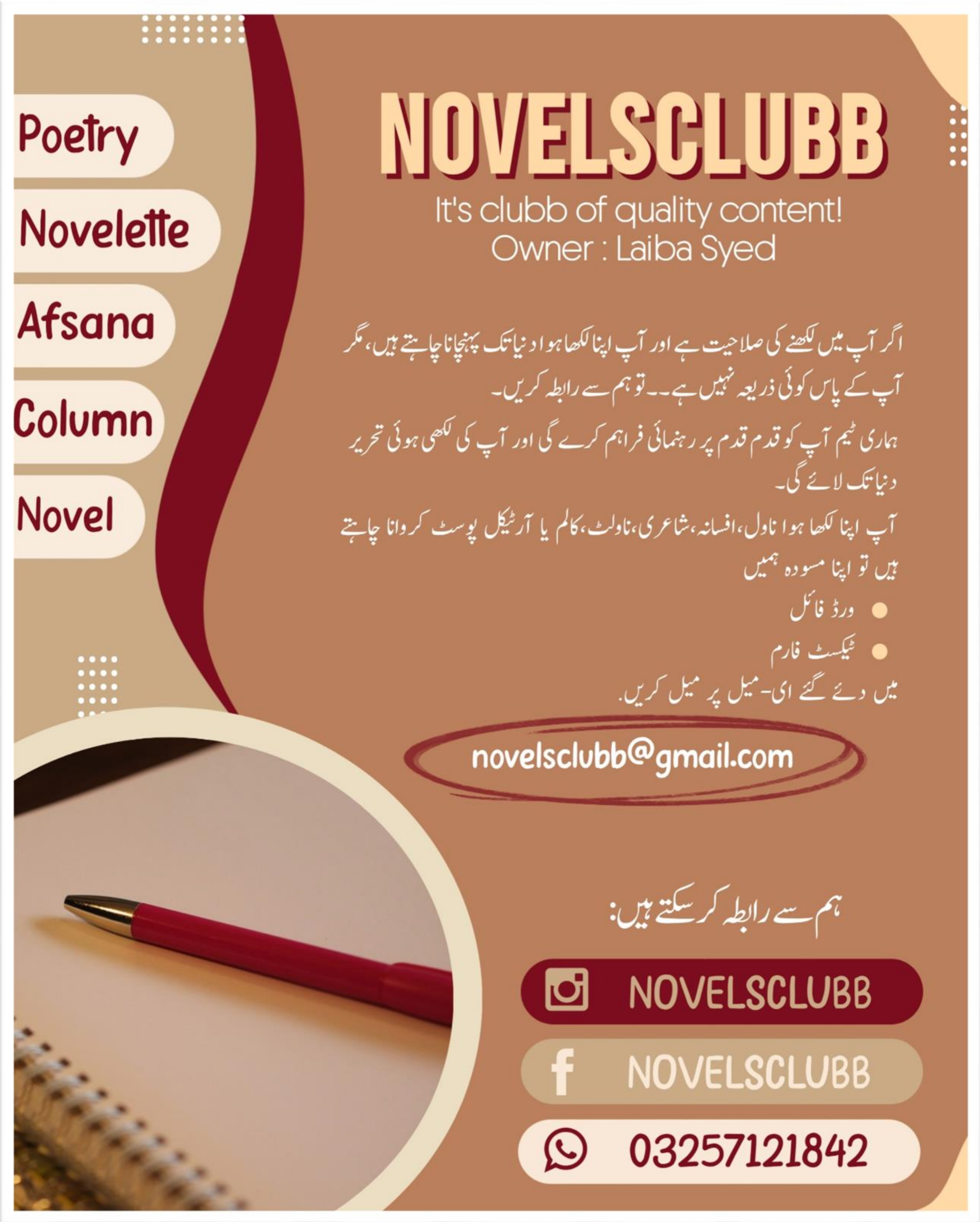

Poetry
Novelette
Afsana
Column
Novel
NOVELSCLUBB
It's clubb of quality content!
Owner : Laiba Syed
اگر آپ میں لکھنے کی صلاحیت ہے اور آپ اپنا لکھا ہوا دنیا تک پہنچانا چاہتے ہیں، مگر آپ کے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے۔۔ تو ہم سے رابطہ کریں۔
ہماری ٹیم آپ کو قدم قدم پر رہنمائی فراہم کرے گی اور آپ کی لکھی ہوئی تحریر دنیا تک لائے گی۔
آپ اپنا لکھا ہوا ناول، افسانہ، شاعری، ناولٹ، کالم یا آرٹیکل پوسٹ کروانا چاہتے ہیں تو اپنا مسودہ ہمیں
ورڈ فائل
ٹیکسٹ فارم
میں دئے گئے ای- میل پر میل کریں.
novelsclubb@gmail.com
ہم سے رابطہ کر سکتے ہیں:
NOVELSCLUBB
NOVELSCLUBB
03257121842

ہلفیتی (بلیک روز)

از قلم

عفیفہ فاطمہ

ناول "بلیک روز" کے تمام جملہ حق لکھاری "عفیفہ فاطمہ" کے نام محفوظ ہیں۔ کہانی کا کوئی بھی حصہ کسی بھی صورت میں
کسی دوسرے پلیٹ فارم یا سوشل میڈیا پر پوسٹ کرنے سے پہلے لکھاری کی اجازت درکار ہوگی۔ "ناولز کلب" کا پی ڈی
ایف بغیر اجازت پوسٹ کرنا منع ہے، بغیر اجازت کہانی/پی ڈی ایف کا استعمال کرنے والوں پر سخت کاروائی کی جا سکتی
ہے۔ اس کہانی اور اس میں موجود کردار محض تصوراتی ہیں۔ کسی بھی حقیقی کہانی یا انسان سے ان کا کوئی واسطہ نہیں
ہے۔ کسی بھی طرح کی مشابہت کو اتفاق سمجھا جائے۔

ناول:۔ ہلفیتی (بلیک روز)

قسط نمبر:۔ 10

شاہد ہاؤس پر اس وقت اندھیرے کا راج تھا۔ اس گھر کی روشنیاں کبھی مدھم نہیں ہوتی تھیں، مگر آج وہاں روشنی بکھیرنے والا شخص اندھیروں میں ڈوب گیا تھا۔ اگر تم گھر کے دروازے سے اندر بڑھو تو پورے گھر میں فقط دو چیزیں ملیں گی۔ گھپ اندھیرا اور خاموشی کا ڈیرا۔ قدم قدم بڑھاتے اندر جاؤ، لاؤنج میں بنی سیڑھیاں چڑھتے اوپر پہنچو تو سامنے ہی ایک بند دروازہ دکھے گا۔ خاموشی سے آگے بڑھو اور اس بند دروازے کو بنا دستک کے کھولو۔ جیسے جیسے دروازہ کھلتا جائے گا ویسے ہی ایک دھن تمہاری سماعتوں سے ٹکرائے گی۔ وہی دھن جو شروع سے اب تک اس کہانی کا حصہ رہی ہے۔ وہی دھن جو کئی لوگوں کی زندگیاں نگل گئی۔

اب اگر ایک آنکھ لگا کر کمرے میں جھانکو تو ایک شخص زمین پر بیٹھا دکھائی دے گا۔ آس پاس ڈھیروں تصاویر پھیلائے وہ آنکھیں بند کیے ہوئے تھا۔

اسی کے ساتھ ایک منظر اس کی بند آنکھوں کے پیچھے جھلملایا۔

ہسپتال کے اس کمرے میں دوائیوں کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ تبھی دروازہ کھول کر شاہد بخاری اندر داخل ہوئے۔ ان کے ہاتھ میں کچھ سامان تھا۔ اندر آتے ہی پہلی نگاہ بستر پر لیٹی صلہ پر گئی۔ وہ آنکھیں کھولے چھت کو تک رہی تھی۔ اس نے دروازے کی آہٹ پر گردن موڑ کر دروازے کی جانب دیکھا۔ جیسے ہی نظر شاہد سے ٹکرائی اس نے نگاہ پھیر لی۔ شاہد بخاری کا دل ڈوب کر رہ گیا۔ وہ اپنے بھاری دل کو سنبھالتے ہوئے خاموشی سے آگے بڑھ آئے۔

"کھانا کھایا میری بیٹی نے؟ طبیعت کیسی ہے اب؟" انہوں نے اپنے لہجے میں فکرمندی سموئے پوچھا۔ صلہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ اب بھی چھت پر لٹکے پنکھے کو تک رہی تھی۔ شاہد گہری سانس بھر کر رہ گئے۔ پھر کرسی گھسیٹ کر اس کے سامنے آبیٹھے۔ سائیڈ ٹیبل پر رکھے سیب اٹھا لیے۔ اب وہ چھری سے وہ سیب کاٹنے لگے تھے۔

”کیا ہوا ہے بچے مجھ سے بات کرو۔ یوں خاموش مت رہو۔“ان کے لہجے میں بے بسی تھی۔ اُس وقت کے بعد سے صلہ نے ان سے کوئی بات نہ کی تھی۔ اس کی خاموشی شاہد بخاری کے دل پر پتھر کی طرح برس رہی تھی۔

”میں نے تمہیں بتایا ہے نا کہ یہ سب میکال کا کیا دھرا ہے۔ میں کبھی اپنی بیٹی کو اس مصیبت میں نہیں ڈال سکتا تھا۔ میں نے اسے روکنے کی بھی کوشش کی تھی پر اس نے میری سنی ہی نہیں۔ انہوں نے صفائی پیش کی۔ صلہ کے گلے میں گلٹی سی ابھری۔

میں نے بہت منت کی تھی اس کی کہ وہ تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچائے مگر اس نے تو جیسے مجھ سے ہر رابطہ قطع کر دیا۔ اس نے ہماری سالوں پرانی دوستی کا بھی بھرم نہیں رکھا۔ اس نے مجھے دھوکہ دیا۔“ان کی آخری بات پر صلہ تلخی سے ہنسی۔ آنکھوں کے کنارے نم ہونے لگے تھے۔

”دھوکہ!“وہ آہستہ سے بڑبڑائی۔ لہجہ طنزیہ تھا۔

”اس نے دھوکہ دیا آپ کو؟“سوال کیا گیا۔ شاہد خاموش ہو گئے۔

”اس نے دھوکہ نہیں دیا آپ کو؟ یہ آپ ہی کا دھوکہ ہے جو آج آپ پر ہی لوٹ کر آیا ہے۔ یہ آپ ہی کے اعمال ہیں، جن کی سزا میں نے بھگتی ہے۔“ وہ بھیگے لہجے میں کہہ رہی تھی۔ اس کے ہر لفظ کے ساتھ شاہد کا دل بھاری ہو رہا تھا۔ ڈھیروں بوجھ ان کے دل پر پڑنے لگا۔

”آپ ہی نے عالمگیر بخاری کو دھوکے سے مارا تھا نا بابا؟" آج ان کی بیٹی ان کے سیاہ کارناموں پر ان سے باز پرس کر رہی تھی۔ شاہد کا دل کیا زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائیں۔

”آپ ہی نے سمریز کو دھوکے سے اپنے سیاہ کام میں شامل کیا تھا نا؟“ شاہد بخاری کی ہمت نہیں تھی کہ وہ نگاہ اٹھا کر اس کی آنکھوں میں دیکھ سکتے۔

”آپ نے سب کو دھوکہ دیا۔ آپ نے میکال کے ساتھ جتنے قتل کیے سب دھوکہ تھا۔ ان مقتولین کے گھر والوں کے ساتھ دھوکہ کیا۔ میڈیا پر آکر آپ اظہارِ تاسف کرتے تھے اور پھر اگلے قتل کی پلاننگ۔ آپ نے ثناء کو بھی مار ڈالا۔ صرف اپنے اس گھنونے کام کیلئے۔“

ثناء کے نام پر دل ذہن میں بہت سے مناظر گھومے تھے مگر تکلیف کہیں نہیں تھی۔ سمریز تو بس اس کا تھا اب۔

"اس کے ماں باپ بوڑھے تھے، بیمار تھے بابا۔ ثناء کی موت نے انہیں بھی مار ڈالا تھا۔ اس کی اماں اب بھی پاگل خانے کے اس کمرے میں اس کا نام لے کر تڑپتی ہیں۔" اس کی آنکھ کناروں سے بہنے لگی۔ گلے میں گرہیں بندھ گئیں، درد، شدید درد ہو رہا تھا اسے۔

شاہد کے ہاتھ پیر بری طرح کپکپاہٹ کا شکار ہونے لگے۔ وہ بار بار اپنے جبڑے بھینچ کر خود کو قابو کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

"کتنی آہیں نکلتی ہوں گی اس ماں کے دل سے۔ کتنی بد دعائیں دیتی ہوں گی وہ، اس شخص کی اولاد کو جو ان کی اولاد کو نگل گیا۔ یہ آپ کے دھوکے اور آپ کے اعمال کا نتیجہ ہے کہ میں یہاں پڑی ہوں!" وہ پوری شدت سے چیخی تھی۔

اگر آج میرا ساتھ سمریز سے نہ جڑا ہوتا تو آپ کی سیاہ کاریاں مجھے کھا جاتیں۔ یہ اس کی قسمت تھی کہ میری قسمت میں جینا لکھ دیا گیا۔ یہ اس کی دعائیں تھیں جنہوں نے مجھے موت کے

منہ سے نکال لیا۔ نہیں تو آپ نے میری حیات کا کوئی راستہ نہیں چھوڑا تھا۔" شاہد کپکپاتے وجود سے نفی میں سر ہلانے لگے۔ انہیں اپنے آس پاس خوف محسوس ہوا۔ صلہ کے ہر لفظ میں سچائی تھی۔ انہوں اپنی سیاہ کاریوں کے بادل اپنے ارد گرد منڈلاتے دکھائی دیے۔

"چلے جائیں آپ یہاں سے۔ چلے جائیں میری زندگی سے۔ میں آج سے صلہ شاہد نہیں رہی۔ میں آج سے آپ کی بیٹی نہیں رہی۔ میں شاہد بخاری کی بیٹی تھی۔ میں خون سے رنگے ہاتھوں والے قاتل کی بیٹی نہیں ہوں۔" اس کے چلانے کے شور سے سمریز بھاگتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ شاہد بخاری غیر ہوتی حالت سے کھڑے کھڑے پیچھے قدم اٹھانے لگے۔ صلہ کی باتیں ان کے ذہن پر ہتھوڑے برسا رہی تھیں۔

سمریز نے آگے بڑھ کر اسے سنبھالنا چاہا۔ وہ اب بھی ان پر چلا رہی تھی۔ انہیں جانے کا کہہ رہی تھی۔ انہیں اپنی زندگی سے جانے کا کہہ رہی تھی۔ شاہد بخاری کیلئے یہ لمحہ قیامت تھا۔ وہ تیز تنفس اور کپکپاتے وجود سے دیوار کے ساتھ بیٹھتے چلے گئے۔ الفاظ سارے ختم تھے۔ جسم

Clubb of Quality Content

سن اور ذہن شل تھا۔ اگر کچھ سمجھ آ رہا تھا تو صرف یہ کہ ان کی بیٹی کو ان کی سیاہ کاری کھا گئی۔

آج انہوں نے اپنی بیٹی بھی کھو دی۔

اندھیرے میں ڈوبے اس کمرے میں بیٹھے، ان کی بند آنکھوں کے کناروں سے آنسو قطروں کی صورت بہہ رہے تھے۔ یوں لگ رہا تھا کہ جیسے زندگی سے جینے کی امید چھین لی گئی ہو۔

انہوں نے ہاتھ بڑھا کر اپنے سامنے پڑی ایک تصویر اٹھائی۔ اس تصویر میں دو لوگ تھے۔ ایک مرد اور ایک عورت۔ مرد کی عمر پچیس چھبیس سال کی تھی اور اس کے ساتھ کھڑی عورت کی عمر پچاس سے اوپر کی تھی۔ وہ مرد اس فربہ سی عورت کے کندھے پر بانہیں پھیلائے محبت سے اسے تک رہا تھا۔

"میرا سب کچھ چھن گیا ماں۔ اس عالمگیر نے مجھ سے تجھے چین لیا تھا اور اب اس کا بھتیجا میری بیٹی کو چھین گیا۔ آخر میرے ساتھ ہی ایسا کیوں ہوا اماں۔ میں نے تو سمریز کو سنبھالنا

چاہا تھا۔ میں نے تو اسے سہارا دیا تھا۔ اس نے مجھے ہی لوٹ لیا۔" وہ تصویر پر ہاتھ پھیرتے مدھم آواز میں کہتے چلے گئے۔

"اسے لگتا ہے میں نے اس کے چچا کو مارا ہے۔ مگر اسے کیسے بتاؤں کہ اس کا چچا وہ نہیں تھا جو دکھتا تھا۔ وہ شخص اس دنیا کی نگاہ میں عظیم تھا مگر اس کا اصل روپ تو صرف شاہد بخاری جانتا ہے۔" آنکھوں میں نمی کے ساتھ حقارت جھلکی۔

"صرف شاہد ہی جانتا ہے کہ دنیا کے سامنے مسیحا کی صورت رکھنے والا عالمگیر بخاری حقیقت میں ایک ناسور تھا۔ ایک ایسا ناسور کو ہمارے معاشرے کی جڑوں کو کھاتا چلا جا رہا ہے۔" ان کی آواز اب بلند ہونے لگی تھی۔ لہجہ بھیگا ہوا اور درشتی لیے ہوئے تھا۔

"وہ شخص میڈیا کے سامنے کچھ اور ہوتا تھا اور بند کیمرے کے پیچھے کچھ اور۔ وہ شخص جو سوشل ورک کے نام پر میڈیا پر بیٹھ کر کروڑوں روپے لوٹاتا تھا در حقیقت وہ صرف دعوے تھے۔ صرف اور صرف جھوٹے دعوے۔ اس کے دعوے ہی میری ماں کو کھا گئے۔" تڑپتے ہوئے وہ تصویر سینے سے لگا گئے۔

عالمگیر بخاری نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ تیرے علاج کیلئے پیسے دے گا۔ اس نے کہا تھا کہ وہ تیرا علاج کروانے کی ہر ممکن کوشش کرے گا۔ لیکن پھر وہ مکر گیا۔ اس نے منہ پھیر لیا تھاماں۔ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو میری ماں مجھے اتنی جلدی چھوڑ کر نہ جاتی۔" وہ کتنی ہی دیر اس تصویر کو سینے سے لگائے بیٹھے رہے۔ ذہن کے آگے بہت سے منظر جھلملائے۔

وہ منظر جب عالمگیر بخاری نے میڈیا کے سامنے بیٹھ کر شاہد بخاری سے ان کی والدہ کے علاج کا پورا خرچہ اٹھانے کا وعدہ کیا تھا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب شاہد بخاری اپنے باپ کی جائیداد کو جوئے میں لٹا چکے تھے۔ ان کی والدہ دن بادن بیماری کے باعث کمزور ہوتی جا رہی تھیں۔ اور ان کا دل اپنی والدہ کی بیماری پر بے چین ہوتا جا رہا تھا۔

ایک دن وہ عالمگیر کے آفس پہنچے۔ وہاں جا کر معلوم ہوا کہ عالمگیر بخاری پریس کانفرنس میں مصروف ہیں۔ وہ اس جگہ پر پہنچے جہاں پریس کانفرنس کا انتظام کیا گیا تھا۔ وہاں ایک طرف میڈیا کے نمائندے بیٹھے تھے اور دوسری جانب بہت سے سوالی۔ وہ سوالی جو ہر

Clubb of Quality Content!

مہینے ایسی ہی ایک پریس کانفرنس میں بٹھائے جاتے۔ جو اپنی مجبوریوں اور ضرورتوں کا رونا روتے اور پھر عالمگیر بخاری کسی مسیحا کی طرح ان سب سے مدد کے وعدے کرتے۔ شاہد بھی جا کر ان سوالیوں کے ساتھ بیٹھ گئے۔

مائیک سب لوگوں سے ہوتا ہوا ان تک آیا۔ عالمگیر بخاری کی اٹھی گردن میں ذرا سا خم آیا۔ ماتھے پر حیرت ابھری مگر وہ خود کو سنبھال گئے۔

"میری والدہ بہت بیمار ہیں، عالمگیر صاحب۔ انہیں جلد از جلد علاج کی ضرورت ہے۔ مگر میری جھولی خالی ہے۔ مجھے میری ماں کے علاج کیلئے مدد درکار ہے۔ براہِ کرم میری والدہ کے علاج کیلئے مدد کریں۔ وہ مر جائے گی۔ وہ مر گئی تو میں بھی مر جاؤں گا۔ میری ماں کی جان بچا لیں عالمگیر صاحب۔" وہ مائیک تھامے ہاتھوں کو آپس میں جوڑ گئے۔ آنکھوں میں نمی کے ساتھ التجا تھی۔ مگر عالمگیر وہ التجا نہیں دیکھ رہے تھے۔ وہ اس نمی کے پیچھے چھپی وہ مکروہ آنکھیں دیکھ رہے تھے جو ہمیشہ سے شاہد بخاری کا خاصہ رہی تھیں۔ وہ منافق آنکھیں جو صرف عالمگیر بخاری ہی دیکھ سکتے تھے۔

وہ چند لمحے ان کو دیکھتے رہے پھر گہرا سانس بھر کر آگے کو ہو بیٹھے۔ ہاتھ بڑھا کر مائیک ٹھیک کیا اور گلا کھنکھارا۔

"آپ کی والدہ کے علاج کا سارا خرچہ اٹھایا جائے گا۔ آپ جاتے ہوئے اپنا نام اور پتہ میری ٹیم کو لکھواتے جائیے گا۔" عالمگیر بخاری نے سنجیدہ نگاہیں ان کی آنکھوں میں گاڑے کہا۔ ساتھ ہی مائیک اگلے بندے کو دینے کا اشارہ کیا۔

شاہد بخاری کی روح تک میں سکون سا اتر گیا۔ وہ اٹھ کر باہر بڑھے۔ عالمگیر کے آفس میں جا کر سکون سے بیٹھ گئے۔ آدھے گھنٹے کے انتظار کے بعد بلآخر دروازہ کھلا اور عالمگیر اندر داخل ہوئے۔ شاہد کو بیٹھے دیکھ انہیں نے اکتائے ہوئے انداز میں گردن گھمائی۔ بازو پر ڈالا کوٹ پٹخنے کے انداز میں کرسی پر رکھا پھر غصے سے شاہد کی طرف مڑے۔ شاہد ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے مسکراتے ہوئے انہیں دیکھ رہا تھا۔

"یہ کیا حرکت تھی شاہد؟" وہ سختی سے دانت جمائے بولے۔

شاہد کی مسکراہٹ سمٹی۔ وہ بھویں سکیڑے میز پر آگے کو جھکا۔

''کیا مطلب کیا حرکت تھی؟ میری ماں واقع مر رہی ہے،عالمگیر۔ وہ موت کے منہ میں ہے اور صرف تم ہو جو اسے بچا سکتے ہو۔''شاہد نے ایک بار پھر التجا کی۔

''یہ منافق چہرہ اور یہ دوغلی نگاہیں کسی اور کو دکھاؤ شاہد بخاری۔''عالمگیر نے انگلی کے اشارے ان کے چہرے پر اشارہ کرتے کہا۔

''تمہارے اس رونے دھونے اور ان مظلوم نگاہوں کا اثر باقی سب پر ہو سکتا ہے مگر مجھ پر نہیں۔ میں اچھے سے تمہاری منافقت سے واقف ہوں۔ مجھے معلوم ہے یہ سب بھی تمہارا ایک نیا طریقہ،ایک نیا انداز ہے مجھ سے پیسے مانگنے کا۔''ان کے لہجے میں حقارت تھی۔شاہد بخاری کا منافق وجود ہمیشہ سے ان کیلئے ناپسندیدہ رہا تھا۔

ی''ہ کوئی نیا طریقہ نہیں ہے عالمگیر۔یہ سچ ہے۔ میری ماں واقعی مر رہی ہے۔وہ کینسر کی ایسی سٹیج پر ہے کہ اگر اب علاج نہ ہوا تو وہ چل بسے گی۔''شاہد کی فریاد پر عالمگیر نے طنزیہ سر جھٹکا۔پھر کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئے۔

''کینسر...''انہوں نے ایک بار پھر سر جھٹکا۔شاہد کے جبڑے تن گئے۔

"اچھا! لیکن ایک منٹ، ایک منٹ ابھی چھ مہینے پہلے ہی تم آئے تھے میرے پاس اور کہا تھا کہ عابدہ چچی کو ہارٹ کا پرابلم ہے اس لیے تمہیں کچھ پیسے چاہیے ہیں۔ کہا تھا نا؟" اتنا کہتے انہوں نے تائید چاہی۔ شاہد دانت سختی سے جمائے انہیں دیکھتے رہے۔

"خدا کی قسم شاہد میں نے بنا کسی جانچ پڑتال کے، بنا کسی پوچھ تاچھ کے فوراً تمہیں چیک کاٹ کر دے دیا تھا۔" وہ ایک لمحے کو رکے۔ چہرے پر مان ٹوٹنے کی کرچیاں بکھریں۔

"مگر پھر کیا ہوا؟ اگلے دو دن بعد مجھے معلوم ہوا کہ تم نے وہ سارا پیسہ جوئے میں لگا دیا۔ تم نے میرا پیسہ اپنے حرام کام میں لٹا دیا۔ اور اب دوبارہ پہنچ گئے ہو میرا پیسہ لٹانے۔ میں تمہیں... ایک پھوٹی کوڑی... بھی نہیں دوں گا۔" وہ چبا چبا کر کہتے بند مٹھی میز پر مار گئے۔

شاہد کے تاثرات یکا یک بدلتے چلے گئے، کندھے ڈھیلے چھوڑ دیے اور بے بسی سے آگے کو جھکے۔

"لیکن یہ جھوٹ نہیں ہے۔ میں نے اس بار کوئی جوا نہیں لگانا۔ اس بار صرف میری ماں کی زندگی ہی داؤ پر لگی ہوئی ہے۔ مجھے صرف اس کی زندگی..."

”جسٹ شٹ اپ!“عالمگیر اس کی بات کاٹتے زور سے چلائے۔

”آج کے بعد تم مجھے میرے آفس کے یا میرے گھر کے آس پاس بھی دکھائی مت دینا شاہد۔ نکل جاؤ یہاں سے۔ میں تمہیں مزید کوئی پیسہ نہیں دوں گا۔“عالمگیر نے آنکھوں میں سختی لیے کہا۔ساتھ ہی فون کا کریڈٹ کان سے لگایا۔

”نہیں یار،دیکھ صرف ایک بار میری بات سن لے۔ صرف ایک بار میری مدد...“

”ہاں سیکیورٹی کو بھیجو۔ ایک جونک چپک گئی ہے اسے کھینچ کر باہر پھینکنا ہے۔“وہ سختی سے کہتے فون رکھ گئے۔

شاہد جو آگے کچھ بولنے لگے تھے ایک لمحے کو چپ سے رہ گئے۔

”تم نے سیکیورٹی کو بلایا؟“وہ بے یقین ہوئے تھے۔

”ہم فیملی ہیں عالمگیر۔ تم،تم یوں ہم سے منہ نہیں موڑ سکتے۔ تم ایک لمحے کو میری بات سن لو۔ یوں اپنا ہاتھ مت کھینچو، میری ماں مر جائے گی۔“وہ بے بسی سے کہتے چلائے۔ مگر عالمگیر بنا اثر لیے کھڑے رہے۔

عالمگیر دیکھو تم ٹھیک نہیں کر رہے۔ تم نے سمریز کو اپنے ساتھ رکھا میں نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ نہیں تو تم جانتے ہو نا میرا اس سے کیا رشتہ ہے۔ میں چاہتا تو اسے اپنے پاس رکھ سکتا تھا۔ مگر میں نے ایسا نہیں کیا۔ میں نے تمہاری بات کا احترام کیا۔ اب تم بھی میرا مان رکھ لو۔ وہ مسلسل التجا کر رہے تھے۔ سمریز کے نام پر عالمگیر نے جبڑے بھینچے۔

”شاہد، وہ میرا خون ہے۔ تم اعتراض کرنے والے ہوتے بھی کوئی نہیں...“

وہ ابھی کہہ ہی رہے تھے کہ سیکیورٹی اندر داخل ہوئی عالمگیر خاموش ہو گئے۔ سیکیورٹی نے شاہد کو بازوؤں سے پکڑا اور پھر وہاں موجود آفس کے ہر شخص نے شاہد کو عالمگیر کے خلاف مغلضات بکتے سنا۔ وہ اسے گالیاں دیتے، چیختے چلاتے وہاں سے نکال دیے گئے۔

اس کے بعد جیسے جیسے شاہد کی ماں موت کے قریب جاتی گئیں شاہد کے دل میں موجود نفرت کا بیج نشو نما پاتا بڑھتے چلا گیا۔

وہ ہمیشہ عالمگیر کو ہی اپنی ماں کے مرنے کا ذمہ دار سمجھتے آئے۔ اور یہ بات آج تک ان کے دل میں پنجے گاڑے ہوئے تھی۔

کچھ دیر بعد وہ تصویر ایک طرف رکھی اور دوسری تصویر اٹھائی۔

وہ صلہ کی تصویر تھی۔ بھورے بال چہرے کے گرد ڈالے وہ مسکراتے چہرے کے ساتھ شاہد کے سینے سے لگی کھڑی تھی۔

”میں نے اسے دھوکہ نہیں دیا تھا بیٹا۔ اس نے مجھے دھوکہ دیا تھا۔ میں نے سمریز کے ساتھ برا نہیں کیا۔ میں اس کے ساتھ کبھی برا نہیں کر سکتا۔ وہ مجھے بہت عزیز ہے۔ اتنا عزیز کے میں نے اسے اپنی محبوب ترین شہہ دینے سے پہلے ایک بار بھی نہیں سوچا۔“ وہ صلہ کے مسکراتے چہرے کو پوروں سے چھوتے کہہ رہے تھے۔ آنکھوں میں ایک نیا راز، نئے مناظر جھلکنے لگے۔ مگر ابھی وہ مناظر کھولنے کا وقت نہیں آیا۔ مگر ایک بات سیاہ گلابوں کے سائے میں پروان چڑھتی اس کہانی میں کئی راز چھپے ہیں۔ ایسے راز جو تمہیں چونکنے پر مجبور کر دیں گے۔

○○○○○○○○○○○○○○○

وہ ابھی ابھی شاور لے کر نکلا تھا۔ تولیا گلے میں لٹکائے وہ ایک ہاتھ سے گردن پونچھ رہا تھا۔ گیلے بال ماتھے پر بکھرے ہوئے تھے اور سیاہ آنکھوں میں الگ ہی چمک تھی۔ اس نے جیسے ہی کمرے میں قدم رکھا تو نگاہ سیدھا اس کمرے میں آئے نئے وجود سے جا ٹکرائی۔ وہ سامنے ہی بستر پر بیٹھی مسلسل انگلیاں چٹخا رہی تھی۔ چہرے پر ڈھیروں پریشانی عیاں تھی۔ تابش کچھ سوچتا اس کے قریب چلا آیا۔

"کیا ہوا ہے؟ آپ مسلسل یہ انگلیاں کیوں چٹخا رہی ہیں؟ کوئی پریشانی ہے؟" وہ اس کے سامنے کھڑا پوچھنے لگا۔ مریم نے نگاہ اٹھا کر اسے دیکھا۔ سیاہ آنکھوں میں سوال تھا۔ مریم ہونٹ کاٹتی نظریں جھکا گئی۔ تابش نے گہرا سانس بھرا پھر اس کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔

"پریشان ہیں تو مجھے بتائیں؟ یوں اندر ہی اندر گھٹنے سے تو کچھ نہیں ہو گا نا؟ اس کی بات پر مریم نے محض سر ہلا دیا۔

"کیا پریشانی ہے؟" تابش نے پھر پوچھا۔

"وہ آنٹی..." مریم دھیمے لہجے میں بولی، انگلیاں چٹخانے کا مشغلہ ایک بار پھر جاری ہو گیا تھا۔

novelsclubb@gmail
www.novelsclubb.com
IG: @novelsclubb

”ارے لڑکی، تم میری امی کو پریشانی کہہ رہی ہو۔“تابش نے مسکراہٹ چھپاتے اسے مصنوعی خفگی سے گھورا۔

”نہیں... میرا وہ مطلب نہیں تھا۔ میں تو...“ مریم واقعی گھبرا گئی تھی۔ اس کا ارادہ مریم کو پریشان کرنے کا بالکل نہیں تھا مگر وہ ہو گئی تھی۔ تابش ماحول کو ہلکا پھلکا کرنے کی غرض سے ہلکا سا ہنس دیا۔ ساتھ ہی پوری طرح اس کی جانب مڑ گیا۔

”کیا ہوا ہے مریم؟ کھل کر کہیں جو بھی بات ہے؟“ مریم نے ایک بار پھر نگاہیں اٹھائیں۔ تابش کی نگاہیں مریم کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ وہ پہلے کبھی نگاہ اٹھا کر بات نہیں کرتا تھا لیکن اب یہ نگاہیں پورے استحقاق سے اٹھی تھیں۔ اس کی آنکھیں بہت خوبصورت تھیں۔ مریم کے دل نے اقرار کیا۔ وہ خود ہی نظریں چرا گئی۔

”آنٹی مجھے باہر دیکھیں گی تو پھر سے غصہ ہو جائیں گی۔“ مریم کی بات پر تابش نے سر ہلکا سا نفی میں ہلایا پھر اس کا ہاتھ تھام لیا۔ مریم نے چونک کر اسے دیکھا۔ تابش خود بھی ایک لمحے کیلئے ساکن ہوا تھا۔ وہ جیسے اپنی ہی حرکت پر حیران ہوا تھا۔ یہ آج پہلی بار ہوا تھا کہ اس نے

بنا کسی ہچکچاہٹ کے کسی لڑکی کا ہاتھ تھاما ہو۔ یہ یقیناً نکاح کی ہی برکت تھی جو اس کے وجود کو گھبراہٹ محسوس نہیں ہوئی تھی۔ وہ دھیما سا مسکراتا اسے دیکھنے لگا۔

"آپ پریشان مت ہوں۔ وہ میری ہی امی ہیں، میں جانتا ہوں وہ مجھ پر جتنا مرضی غصہ کر لیں آپ کو ایک لفظ نہیں کہیں گی۔" تابش نے اس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا تھا۔

"تو یہ بھی تو پریشانی والی بات ہے نا کہ وہ مجھ سے ایک لفظ بھی نہیں بولیں گی..." مریم نے بات کے بیچ میں ہی ہلکی سی پلکیں اٹھا کر تابش کو دیکھا۔ وہ بغور اسے سن رہا تھا۔ وہ پھر پلکیں جھکا کر کہنے لگی۔

"جب تک وہ بات نہیں کریں گی تب تک ان کے دل میں میرے بارے میں جو بھی خیالات ہیں وہ کیسے ٹھیک ہوں گی۔ تب تک وہ مجھے قبول بھی نہیں کریں گی۔" تابش نے اس کی بات پر سمجھتے ہوئے سر ہلا دیا۔

Clubb of Quality Content

"آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں لیکن آپ فکر مت کریں۔ ابھی وہ ذرا پریشان ہیں، شاک بھی تو کافی بڑا تھا۔ پر وہ جلد ہی ٹھیک ہو جائیں گی۔" اس نے اپنے دونوں ہاتھوں میں دبے اس کے ہاتھ کو ہلکا سا دبایا۔

"مریم!" تابش کی آواز پر مریم نے پلکیں اٹھائیں۔ وہ گردن ہلکی سی ایک طرف جھکائے اسے بغور دیکھ رہا تھا۔

"میں نے آپ سے وعدہ کیا ہے کہ آپ کو ملکہ بنا کر رکھوں گا اور ملکہ پریشان ہوتی ہوئی بالکل اچھی نہیں لگتی۔ آئندہ ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں پر ٹینشن مت لیجیے گا۔" تابش کی سیاہ آنکھوں میں نرم سا تاثر تھا۔ مریم چند لمحے اسے دیکھتی رہ گئی۔ کیا یہ اس کی تکلیفوں کا مداوا تھا؟ کیا یہ اس کے صبر کا انعام تھا؟ آنکھوں میں نمی سی اترنے لگی تھی۔ وہ فوراً پلکیں جھکاتی اثبات میں سر ہلا گئی۔ اسے مریم کا یوں پلکیں اٹھانا جھپکانا اچھا لگ رہا تھا۔ تابش نے اس کا ہاتھ تھپکا پھر دھیرے سے چھوڑتا اٹھ کھڑا ہوا۔

"آپ تیار ہو جائیں پھر باہر چلتے ہیں۔" وہ تولیا بستر پر ہی ایک جانب رکھتا صوفے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ مریم نے ایک نگاہ بستر پر گرے تولیے پر ڈالی پھر تولیا پھینکنے والے پر۔

"پر میں پہنوں گی کیا؟ میرے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے۔" وہ اب پورے کمرے کا جائزہ لینے لگی تھی۔ کمرہ زیادہ بڑا نہیں تھا، نہ ہی زیادہ خوبصورت، بس مناسب سا تھا مگر وہاں ایک سکون تھا۔ وہاں ایک بیڈ، چھوٹی سی ڈریسنگ اور ایک تھری سیٹر صوفہ موجود تھا۔ اس صوفے کے سامنے ایک چھوٹی سی شیشے کی میز پڑی تھی، مگر مریم کی نگاہیں فرنیچر نہیں بلکہ ان پر بکھرا سامان دیکھ رہی تھیں۔ دو شرٹیں صوفے پر پڑی تھیں۔ ڈریسنگ ٹیبل پر کوئی ایک چیز بھی ترتیب سے نہیں تھی۔ حتیٰ کہ کاغذات تک وہاں بکھرے پڑے تھے۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اس کمرے کے مکین کو چیزیں پھیلانا بے حد پسند تھا۔ مریم کو وہ بکھری چیزیں دیکھ کر الجھن سی ہوئی۔ وہ ہمیشہ چیزیں سلیقے سے رکھنے کی عادی تھی۔ مگر یہاں اسے سمجھوتہ کرنا ہی پڑے گا۔

تابش نے مڑ کر اسے دیکھا۔ وہ اس وقت بھی میرب کے کپڑے پہنے ہوئے تھی۔

"ہاں! بات تو صحیح ہے۔" وہ سر کھجاتا بولا۔

میں میرب سے کہتا ہوں کہ وہ آپ کو کوئی سوٹ دے جائے۔ باقی آج شام کو آپ میرے ساتھ چلیے گا آپ کیلئے شاپنگ کر لیں گے۔" تابش کی بات پر وہ سر ہلا گئی۔ پھر دونوں کے بیچ خاموشی چھا گئی۔ تابش نے محسوس کیا تھا کہ وہ بار بار نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھتی ہے پھر جھکا لیتی ہے۔ وہ دل ہی دل میں مسکراتا رہ گیا۔ کچھ دیر بعد بال بناتا باہر بڑھ گیا۔

○○○○○○○○○○○○○○○○○○○

تابش کے جانے کے چند لمحوں بعد میرب ہاتھ میں دو تین سوٹ لیے اس کے کمرے میں داخل ہوئی۔ مریم اسے دیکھ کر کھڑی ہو گئی۔ ناجانے کیوں جب سے وہ یہاں آئی تھی اسے میرب سے بھی گھبراہٹ ہونے لگی تھی۔ شاید اس لیے کیونکہ وہ جانتی تھی کہ میرب نے تو اسے صلہ کی دوست کے روپ میں بھی قبول نہیں کیا تھا، اب اپنے بھائی کی بیوی کے طور پر کیسے قبول کر لیتی؟

”ارے بیٹھو بیٹھو! میں تو بس یہ دینے آئی تھی۔“ وہ ہاتھ کے اشارے سے کہتی اس کی طرف آئی۔ مریم کھڑی ہی رہی۔

”ایم سوری! مجھے خود خیال کرنا چاہیے تھا کہ تمہیں مزید کپڑے بھی تو چاہیے ہوں گے۔ سب اتنی جلدی میں ہوا ہے کہ میرا دماغ اب تک کام نہیں کر رہا۔“ وہ ماتھے پر ہاتھ مارتی بیڈ پر بیٹھ گئی۔ کپڑے مریم کے سامنے رکھ دیے۔ مریم خاموشی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

میرب مسکرا رہی تھی، اتنی خوش اخلاقی سے اس سے بات کر رہی تھی۔ کیا یہ حقیقت تھی؟

”خیر تم مجھے یہ بتاؤ کہ یہ سب ہوا کیسے؟ اور یہ میرا میسنا بھائی اس نے اتنا بڑا قدم اٹھا کیسے لیا؟ اور کب سے چل رہا ہے یہ سب؟“ میرب شرارتی نگاہوں سے اسے دیکھتی پوچھ رہی تھی۔

مریم چند لمحے لب کاٹتی اسے دیکھتی رہی پھر آہستگی سے بولی۔

”مجھے نہیں معلوم کہ انہیں میری شادی کے بارے میں اور ماموں جان کے کنٹریکٹ کے بارے میں کیسے معلوم ہوا۔ وہ بس عین موقعے پر وہاں پہنچ گئے اور انہوں نے مجھ سے شادی کی پیش کش کی۔“ اسی کے ساتھ مریم نے میرب کو شروع سے آخر تک ہر بات بتا دی۔

”او ہو! یعنی تابش صاحب نے عین نکاح کے وقت وہاں انٹری ماری اور رعب دار آواز میں سینہ چوڑا کر کے کہا کہ رک جائیے قاضی صاحب یہ نکاح نہیں ہو سکتا؟“ میرب نے اپنی آواز بھاری کر کے پوری اداکاری کرتے ہوئے کہا تو مریم کی ہنسی چھوٹ گئی۔ ساتھ ہی اس نے میرب کے بازو پر ہلکی سی دھپ لگائی۔ چند لمحے میرب یوں ہی اسے چھیڑتی رہی پھر چند لمحوں بعد جانے کیلئے کھڑی ہوئی۔

”چلو، تم ان میں سے کوئی بھی سوٹ پہن لو۔ یہ سب بالکل نئے ہیں میں نے ایک بار بھی ہاتھ نہیں لگایا نہیں۔ ویسے تم یہ ریڈ پہن لو۔ تم پر یہ کلر سوٹ کرے گا اور نئی نویلی دلہن بھی ہو تو اچھا لگے گا۔“ پھر خود ہی جاتے جاتے بولی۔ مریم تو بس اس کے تیور دیکھ رہی تھی۔

”میرب!“ مریم نے اسے پکارا تو وہ جو دروازے کی طرف بڑھ رہی تھی رک گئی، مڑ کر سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔

”کیا تمہیں مجھ پر غصہ نہیں آ رہا؟“ مریم کے سوال پر میرب نے بھنویں نا سمجھی سے سکیڑیں۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ تم تو مجھے بالکل پسند نہیں کرتیں۔ تم تو مجھے صلہ کے ساتھ بھی برداشت نہیں کرتی تھیں۔ مگر اب... اب یہاں اپنے گھر میں، اپنے بھائی کے ساتھ کیسے برداشت کر رہی ہو۔ تمہارا دل کر رہا ہو گا نا کہ مجھے دھکے دے کر اپنے گھر سے نکال دو؟" مریم نے وہ بات کہہ دی جو اسے کافی دیر سے پریشان کیے جا رہی تھی۔

میرب چند لمحے اسے دیکھتی رہی پھر گہری سانس بھرتی اس کے قریب چلی آئی۔

"دیکھو مجھے تمہاری صلہ کے ساتھ دوستی واقعی بے حد بری لگتی تھی۔ شاید میں ان سیکیور تھی کہ صلہ مجھے بھول جائے گی۔ کیونکہ وہ پہلے بھی مجھ سے دوستی نہیں کرتی تھی، کہتی تھی کہ اس کے پاس پہلے ہی دوست موجود ہے۔" وہ مدھم لہجے میں کہنے لگی۔ انداز میں ایک اداسی سی گھل گئی تھی جیسے کچھ اسے اندر سے پریشان کر رہا ہو۔

"لیکن جانتی ہو کیا؟ پچھلے دنوں سے کچھ بدل سا گیا ہے۔ مجھے لگنے لگا ہے جیسے کچھ بھی ہمارے ہاتھ میں نہیں ہوتا۔ ہم چاہ کر بھی کسی کو کنٹرول نہیں کر سکتے۔ ہم بس اپنے حصے کا ساتھ نبھا

سکتے ہیں، ہم دوسرے کو مجبور نہیں کر سکتے۔" وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبی بول رہی تھی۔
مریم غور سے اسے دیکھے گئی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے میرب نہیں کوئی گہرا تجربہ بول رہا ہو۔
"اس لیے مجھے اب تم دونوں کی دوستی سے فرق نہیں پڑتا۔ اس کی اپنی زندگی ہے، اپنی خوشی ہے، وہ جس سے چاہے دوستی کرے بس مجھے اپنی طرف سے دوستی نبھانے کی کوشش کرنی چاہیے۔" میرب آج کافی فراخ دلی کا مظاہرہ کر رہی تھی مگر مریم تو اس مظاہرے کے پیچھے چھپی وجہ کو جاننا چاہتی تھی۔
"اور جہاں تک بات ہے تابش کی تو وہ میرا بھائی ہے اور میرے لیے ہمیشہ اس کی خوشی سے بڑھ کر کچھ بھی عزیز نہیں رہا۔ میں اس سے لڑتی ہوں، اسے بہت تنگ کرتی ہوں لیکن پھر بھی وہ مجھے بے حد عزیز ہے۔ یا ایسا کہہ لو کہ میرب کمال کو خود سے جڑا ہر رشتہ عزیز ہے۔ اور اب چونکہ تم تابش کی بیوی ہو اور اس کی پسند بھی، تو تم بھی مجھے عزیز ہو گئی ہو۔" وہ بات مکمل کر کے مسکرائی تو مریم بھی مسکرا دی۔ یوں لگا جیسے وہ میرب کمال سے پہلی بار مل رہی ہو۔

”مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم اپنوں کیلئے اتنی جان چھڑکنے والی ہوں گی۔ میں تو تمہیں بس خود غرض سمجھتی رہی ہمیشہ۔“ مریم نے صاف گوئی سے کہا۔

”جان چھڑکنے والی بھی اور جان لینے والی بھی۔ میرب کمال اپنوں کیلئے کچھ بھی کر سکتی ہے۔“ وہ کندھے پر بکھرے بال ایک ادا سے ہٹاتی بولی۔ اپنا ازلی مغرورانہ انداز اب بھی قائم رکھا۔

”چلو تم چینج کر لو میں ناشتہ بناتی ہوں پھر کیفے بھی جانا ہے۔ صلہ کو سرپرائز بھی تو دینا ہے۔ اُف! مجھے تو ابھی سے اس کے تاثرات کا سوچ سوچ کر مزہ آرہا ہے یار! کتنا مزہ آئے گا جب اسے پتہ چلے گا کہ تمہاری اور تابش کی شادی ہو گئی ہے۔ اور تم میری بھابھی بن گئی ہو۔“ وہ پرجوش سی بولی۔ مریم شرمیلی سی مسکراہٹ کے ساتھ سر ہلا گئی۔

ooooooooooooooooo

وہ دونوں گاڑی میں بیٹھے تھے۔ سمریز خاموشی سے ڈرائیو کر رہا تھا اور ساتھ ہی ساتھ گاہے بگاہے ایک نگاہ اپنے ساتھ بیٹھی صلہ پر بھی ڈال لیتا۔ وہ چپ تھی بالکل چپ...

سمریز جانتا تھا یہ خاموشی ظاہری تھی، اس خاموشی کے پیچھے اس وقت ایک گہرا شور برپا تھا۔ صلہ کو دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ خود پر ضبط کیے بیٹھی ہے۔ وہ دونوں عالیان کو سکول چھوڑنے کے بعد ہسپتال گئے تھے۔ اس دن صلہ کی غیر ہوتی حالت نے ان دونوں کو ہی پریشان کر دیا تھا۔ اسی لیے سمریز آج اسے چیک اپ کیلئے ہسپتال لایا تھا۔ مگر ڈاکٹر کے کہے گئے جملے تو صاعقۂ خبر بن کر ان کے کانوں میں گونج رہے تھے۔

”دیکھیں آپ کی بیوی کی حالت ویسے تو ٹھیک ہے مگر ان کا سانس رکنا اور پھر بنا انہیلر کے سانس کا بحال نہ ہونا شاید کبھی ٹھیک نہ ہو سکے۔ مجھے یہ کہتے ہوئے بہت افسوس ہو رہا ہے مگر آپ کی بیوی کو استمھا اٹیک ہوا ہے۔ اور یہ دوبارہ بھی ہو سکتا ہے۔ ان کی سانس کی نالیاں پہلے ہی کمزور تھیں مگر اس بار جو انہوں نے دو گھنٹے اس پوائزن گیس میں بیتائے ہیں اس سے ان کے پھیپھڑوں میں شدید انفیکشن اور سوزش ہو گئی ہے۔“ وہ سفید کوٹ میں ملبوس ڈاکٹر کہہ رہے تھے اور وہ دونوں دم سادھے انہیں سن رہے تھے۔

”میں کچھ دوائیاں لکھ کر دے رہا ہوں آپ وہ لیں اور اس کے ساتھ ساتھ ان چند چیزوں سے احتیاط برتیں۔ انہیلر ہمیشہ اپنے ساتھ رکھیے گا اور کوشش کیجیے گا کہ سٹریس اور ٹینشن کم سے کم لیں۔ کیونکہ اس سے بھی آپ کا سانس اٹکنے لگتا ہے۔“ڈاکٹر اسے ہدایت دے رہا تھا اور صلہ کو لگ رہا تھا کہ اس کا سانس واقعی اٹک رہا ہے۔ وہ منجمد سی بیٹھی رہی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر اپنے گلے کو چھونا چاہا کیونکہ وہاں گھٹن ہونے لگی تھی مگر جسم جیسے برف ہو گیا تھا۔ وہ ہاتھ اٹھا نہ سکی۔

سمریز خود پریشانی سے پیشانی چھوتا کبھی ڈاکٹر کو دیکھتا کبھی صلہ کو۔ صلہ کو کسی مجسمے کی مانند خاموش دیکھ اسے کچھ کھٹکا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر میز کے نیچے رکھے اس کے ہاتھ کو تھاما۔ صلہ کا ہاتھ برف کی مانند ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ سمریز کے ہاتھوں کی فگمائش ملی تو جیسے برف کے مجسمے میں دراڑ پڑی۔ صلہ کا رکا سانس یکدم ہی بحال ہوا اور پھر... ایک زور کی سسکی اس کے گلے سے برآمد ہوئی۔ جسے وہ بروقت ہی گلے میں دبا گئی۔ ڈاکٹر جھک کر اپنی ڈرائر سے کچھ نکال رہا تھا۔ وہ صلہ کے تاثرات دیکھ نہ سکا مگر سمریز نے اس کی بحالی ہوتی سانس اور

پھر گلے سے نکلنے والی وہ سسکی سن لی تھی۔ وہ ہلکے سے اس کا ہاتھ سہلانے لگا۔ جیسے خاموشی سے ایک اندیکھی تسلی تھمارہا ہو۔ وہ دونوں خاموشی سے ڈاکٹر کی بات سنتے رہے اور پھر گاڑی میں آکر بیٹھ گئے۔ دونوں کے بیچ وہ خاموشی اب بھی قائم تھی۔ صلہ بے یقینی کے باعث خاموش تھی اور سمریز اسے خاموش دیکھ کر چپ تھا۔

کافی دیر بعد بھی جب صلہ کچھ نہ بولی تو سمریز نے خود ہی اس خاموشی کو توڑنے کا سوچا۔

"صلہ! تم ٹھیک ہو؟" وہ دیکھ تو سامنے رہا تھا مگر دل و دماغ کی ہر حسیات صلہ پر مرکوز تھی۔

صلہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ سمریز نے گردن پھیر کر اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے بھل بھل آنسو بہنے لگے تھے۔ وہ گہری سانس بھر کر رہ گیا۔

وہ گاڑی تھوڑی کم رش والی سڑک پر لے آیا۔ پھر ہاتھ بڑھا کر صلہ کا ہاتھ تھاما۔

"تم بالکل ٹھیک ہو یار۔ یہ چھوٹے موٹے پرابلمز آتے رہتے ہیں۔ ویسے بھی ڈاکٹر نے کہا ہے کہ تمہارا استھما کوئی سویئر قسم کا نہیں ہے۔ تھوڑی بہت احتیاط رکھیں گے تو انشاءاللہ دوبارہ اٹیک نہیں ہوگا۔" وہ اسے سمجھانے لگا تھا مگر صلہ تو جیسے ایک ہی چیز پر اٹک گئی تھی

کہ اب انہیلر ہمیشہ ساتھ رکھنا ہو گا۔ یعنی وہ سانس لینے کیلئے بھی محتاج ہو گئی تھی۔ وہ ایک انڈیپینڈنٹ لڑکی تھی۔ اسے آزادی پسند تھی اسے یہ بیماری قید لگنے لگی تھی۔

”صلہ کچھ تو بولو یار؟ کم از کم یہ تو بتاؤ کہ تمہارے ذہن میں چل کیا رہا ہے۔ بات نہیں کرو گی تو معاملہ کیسے حل ہو گا؟“ سمریز اس کی خاموشی سے عاجز آیا۔ وہ بس روئے چلی جا رہی تھی۔

اس کی بات پر صلہ نے نم زدہ سی سانس کھینچی اور چہرے کے گرد لپٹا سرخ رنگ کا حجاب درست کرنے لگی۔

”کوئی مسلہ نہیں ہے۔ ایم سوری، میں نے تمہیں پریشان کر دیا۔“ وہ بھیگے لہجے میں بولی۔

سمریز نے تلخی سے سر ہلایا۔

”نہیں صلہ! ایسی کوئی بات نہیں ہے یار۔ تم آج کل اتنی اوور تھنکنگ کیوں کرنے لگی ہو۔“

وہ واقعی آج کل ایسی باتیں کرنے لگی تھی۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کو محسوس کرتی تھی اور بلاوجہ ہی خود کو الزام دینے لگتی۔

Clubb of Quality Content

"یار تم تو مجھے تنگ کرنے کے بعد بھی کبھی نہیں سوچتی تھیں اور اب اچانک اس طرح کا رویہ..."

سمریز کی بات پر صلہ کے رونے میں مزید روانی آ گئی۔

"تمہاری زندگی میں پہلے ہی اتنی پرابلمز ہیں اور ایک میں بھی تمہارے سر پر سوار ہو گئی ہوں۔ تم میری وجہ سے اپنے کیس پر بھی دھیان نہیں دے پا رہے۔ پہلے ہی پچھلے ایک ہفتے سے تم میری وجہ سے پولیس سٹیشن نہیں جا رہے تھے سارے گھر کی زمہ داری بھی تم پر آ گئی تھی۔ اور اب دیکھو..." وہ دو لمحے کیلئے رکی پھر آنسوؤں کا گولہ نگلتی دوبارہ بولی۔

"اب تو ساری زندگی اس بیمار کی پڑیا کو سنبھالتے پھرو گے۔" اتنا کہتی وہ دوبارہ سسک اٹھی۔ سمریز جو خاموشی سے اسے سن رہا تھا اس کی آخری بات پر دل کٹ سا گیا۔

کیا یہ وہی صلہ تھی جو ہمیشہ دوسروں کو اپنی جوتی کی نوک پر رکھتی تھی؟

کیا یہ وہی صلہ تھی جو ہمیشہ پورے اعتماد کے ساتھ بات کرتی تھی؟ نہیں... یہ لڑکی تو جیسے ٹوٹ گئی تھی۔ اور وجہ کون تھا؟ اس لڑکی کا اپنا باپ۔ وہی شخص جس نے اس دشمنی اور انتقام کا آغاز کیا تھا اور اس کی اپنی بیٹی بھی اس سیاہ کھیل کا حصہ بن گئی تھی۔

سمریز نے مزید اس سے کوئی بات نہ کی۔ اس کے چہرے پر یکدم ہی سختی در آئی تھی۔ وہ جبڑے بھینچے گاڑی کسی اور راستے پر ڈال گیا۔ اس کی خاموشی نے صلہ کو مزید بے چین کر دیا۔ وہ چاہتی تھی کہ وہ کچھ بولے۔ کوئی تسلی بخش لفظ یا کوئی محبت بھرا جملہ۔ کچھ ایسا کہے کہ اس کے دل کو راحت مل جائے مگر ایسا نہ ہوا۔ سمریز نے اسے کوئی تسلی نہ دی۔ اور اس بات سے صلہ کا دل مزید بھر آیا۔ وہ بھی تو مرد ہے نا بھلا بیمار بیوی سے کون محبت کرتا ہے؟ وہ دل میں سوچتی رہی گئی۔

ooooooooooo

کافی دیر بعد سمریز نے ایک جگہ گاڑی پارک کی اور اسے اترنے کا کہا۔ وہ جو سر جھکائے آنسو بہائے جا رہی تھی چونک کر اس کی جانب مڑی۔

"نیچے اترو صلہ مجھے لگتا ہے ہمیں بات کرنی چاہیے۔" صلہ کو سوالیہ نگاہوں سے دیکھتے دیکھ سمریز نے کہا۔ صلہ نے سامنے دیکھا وہ ساحلِ سمندر تھا۔ صبح کے وقت وہ جگہ بالکل خالی تھی۔ دور دور تک کوئی انسان دکھائی نہ دے رہا تھا۔ وہ خاموشی سے نیچے اتر گئی۔ سمندر کی تر و تازہ ہوا نے اس کے وجود کا گھیراؤ کیا، مگر وہ نہ اس ہوا کو محسوس کر رہی تھی اور نہ ہی سمندر کے کنارے پر چھائی اس خاموشی کو وہ بس سمریز کے الفاظ سوچ رہی تھی۔ وہ بات کرنا چاہتا تھا مگر کیا بات؟ اس کی ذہنی حالت ایسی تھی کہ چاہ کر بھی کوئی اچھا خیال ذہن میں نہ آتا تھا۔

سمریز گاڑی سے اتر کر اس کے سامنے آیا۔ صلہ پریشان نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ سمریز نے بنا کچھ کہے اس کے پہلو میں گرا ہاتھ تھاما اور اسے لیے آگے بڑھنے لگا۔ وہ نگاہیں جھکائے اس کے ساتھ بڑھ رہی تھی۔ وہ سفید لانگ شرٹ اور ٹراؤزر میں ملبوس تھی ساتھ میں سرخ رنگ کا حجاب لپیٹ رکھا تھا۔ پاؤں میں فلیٹ شوز پہن رکھے تھے۔ اس کے برعکس سمریز پولیس وردی میں ملبوس تھا۔ اسے ابھی پولیس سٹیشن کیلئے نکلنا تھا۔ وہ دونوں

سمندر کی جانب بڑھ رہے تھے۔ ساحل کی ریت پر ان دونوں کے ساتھ بڑھتے قدموں کے نشان چھپتے چلے جا رہے تھے۔ ایک سیدھ میں، ایک لکیر میں، ایک ساتھ۔

سورج کی نرم گرم سی دھوپ اس ٹھنڈ میں سکون پہنچا رہی تھی۔ وہ دونوں خاموشی سے بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ صلہ گردن جھکائے آگے بڑھ رہی تھی نا جانے کیوں اسے اپنا آپ سمریز کے سامنے کم تر محسوس ہو رہا تھا۔

وہ چلتے چلتے سمندر کے بالکل قریب پہنچ گئے۔ اتنے قریب کے سمندر کی لہریں ان کے قدموں کو چومتی واپس پلٹنے لگیں۔ سمریز نے وہاں رک کر اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ صلہ خاموشی سے اپنے خالی ہاتھ کو دیکھنے لگی۔

”جانتی ہو صلہ میری زندگی میں ایک وقت ایسا آیا تھا کہ میں بالکل تنہا رہ گیا تھا۔ میرے پاس نہ کوئی رشتہ بچا تھا، نہ ہی کوئی سہارا۔ بچی تھی تو صرف تنہائی اور یادیں۔ ایسی یادیں جو خوشی کے لمحات کی تھیں مگر تنہائی میں کاٹ کھانے کو دوڑتی تھیں۔“ وہ سمندر میں بنتی ان

لہروں کو دیکھتے کہہ رہا تھا۔ صلہ سر اٹھا کر اسے دیکھنے لگی۔ اس کا لہجہ ٹوٹا ہوا تھا اور آنکھوں میں ان یادوں کا سوچ کر آج بھی کرچیاں سی بکھر گئی تھیں۔

"میں سارا سارا دن گھر سے باہر رہتا۔ رات کو دیر سے گھر آتا اور تب بھی اس گھر کا ایک ایک کونا، اس گھر کی ایک ایک چیز مجھے خوفزدہ کرتی تھی۔ مجھے ہر چیز، ہر ذرے سے چاچو کی آواز آتی۔ مجھے وہ اپنے آس پاس محسوس ہوتے مگر جیسے ہی میں انہیں چھونے کی کوشش کرتا وہ غائب ہو جاتے۔ میں پھر تنہا رہ جاتا۔ وہ، ان کی یادیں، ان کی خوشبو، ان کی موجودگی ہر چیز فنا ہو جاتی۔" وہ ایک لمحے کو خاموش ہوا۔ بہت کچھ نم سانس کے ساتھ اندر اتارا۔

"دل بہت تڑپتا تھا۔ جب ان کی یاد آتی تھی تب بھی اور جب وہ ہر جگہ سے غائب ہو جاتے تب بھی۔ مجھے... مجھے لگنے لگا تھا کہ یہ تنہائی مجھے پاگل کر دے گی۔ تب میں نے فیصلہ کیا کہ نہیں سمریز، اور نہیں۔ مجھے خود کو سنبھالنا ہو گا۔ مجھے چاچو کا بدلہ لینا ہے۔ میرے چاچو کا خون اتنا سستا نہیں تھا کہ میں بھول جاؤں یا پھر خود کو دیوانہ بنا دوں۔ صلہ کو اس کی نگاہوں میں

تکلیف دکھ رہی تھی۔ بعض اوقات ہمیں لگتا ہے کہ ہماری زندگی زیادہ مشکل ہے مگر حقی میں ہر انسان کی زندگی ہی مشکلات میں ڈوبی ہوتی ہے۔

"بس پھر میں نے اپنے ذہن پر، اپنی یادوں پر قابو پانے کی کوشش کی۔ میں نے خود کو اس اذیت سے نکالنے کی کوشش کی۔ اور کامیاب بھی رہا۔ بعض اوقات تنہائی میں وہ بہت بری طرح یاد آتے تھے مگر میں خود کو پرسکون کرنا سیکھ گیا تھا۔" اس نے چہرہ موڑ کر صلہ کو دیکھا۔ وہ اسے سن رہی تھی۔ بھوری آنکھوں میں نمی تھی جو سورج کی روشنی میں چمک رہی تھی۔ سمریز کو وہ آنکھیں اس وقت بہت حسین لگیں۔

"زندگی میں بہت سے لوگ ایسے آئے جنہوں نے مجھے گرانے کی کوشش کی۔ جانتی ہو چند لوگوں نے تو مجھے سبز قدم تک کہا۔ کہنے لگے کہ یہ شخص پہلے اپنے ماں باپ کو کھا گیا اور اب اپنے چچا کو۔ اور دیکھو اس کے بعد میری بیوی بھی چلی گئی۔" سمریز تلخی سے ہنسا۔ صلہ کی آنکھوں میں اس کی بات پر تکلیف ابھری۔ کیا کوئی اتنا تلخ باتیں بھی کر سکتا ہے؟

”میں چاہتا تو ان کی باتوں کو دل سے لگالیتا یا ان کی باتوں کو سچ مان کر بیٹھ جاتا کہ ہاں میں ہی سبز قدم ہوں۔ میری قسمت ہی میرے اپنوں کو کھا جاتی ہے۔ مگر میں نے یہ سب نہیں سوچا صلہ۔“ وہ جھک کر اس کی آنکھوں میں دیکھتا کہہ رہا تھا۔ وہ نم آنکھیں آج ڈھیروں معصومیت لیے ہوئے تھیں۔

”جانتی ہو جب انسان پریشان ہوتا ہے تو وہ سب سے پہلے خود کے ساتھ غلط کرتا ہے۔ وہ خود کو ذہنی تکلیف دینے لگتا ہے۔ وہ خود کو کم تر سمجھنے لگتا ہے۔ وہ خود کو دوسروں پر بوجھ سمجھنے لگتا ہے۔ اور یہ دنیا تو ہوتی ہی انتظار میں ہے کہ کب کوئی ٹوٹ کر گرے اور یہ دنیا اسے خود میں سمالے۔“ وہ سمریز کی ہر بات سمجھ رہی تھی۔ گلہ رندھنے لگا تھا۔ صلہ لب کاٹتی خود پر ضبط کرنے لگی۔ سمریز نے ہاتھ بڑھا کر اس کا چہرہ تھاما۔

”مگر ہمیشہ یاد رکھنا انسان کے اپنے لیے اس کی اپنی ذات سے بڑھ کر کچھ اہم نہیں۔ تم پریشان ہو اس لیے خود کو مجھ پر بوجھ سمجھ رہی ہو۔ خود کو پرسکون کرو اور میری نگاہ سے خود

کو دیکھو۔" صلہ نے نگاہ اٹھا کر سمریز کی آنکھوں میں دیکھا۔ شہد رنگ آنکھیں پوری سنجیدگی سے اسے سمجھا رہی تھیں۔ اس سنجیدگی کے پیچھے ایک گہری فکر چھپی تھی۔

"میری نگاہ میں تم بہت اہمیت رکھتی ہو صلہ۔ تم وہ عورت ہو جس نے ساتھ نبھایا ہے۔ تم وہ عورت ہو جس نے میرے جھٹکنے کے باوجود مجھے تھامے رکھا ہے۔ تم وہ عورت ہو جس نے میرے گھر کو آباد کیے رکھا ہے۔" سمریز کے ہر جملے کے ساتھ صلہ کی آنکھوں میں آنسو بھرتے چلے گئے۔

"تم نے میری اولاد کی جان بچائی ہے، میں تو تمہارا احسان مند ہوں یار۔ اور تم ہو کہ خود کو مجھ پر بوجھ سمجھ رہی ہو۔ سمریز نے ہاتھ کے انگوٹھے سے اس کی آنکھوں سے بہتے آنسو صاف کیے۔ پھر بازو اس کے کندھے کے گرد پھیلا کر اسے قریب کیا اور سینے سے لگالیا۔

صلہ یکدم ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ سمریز نے اسے رونے دیا۔ دل میں موجود درد اور تکلیف آنسوؤں کے ذریعے بہنے دی۔

ناولز کلب
Clubb of Quality Content!

کچھ دیر بعد وہ آنسو بہا کر خاموش ہوئی اور سر اس کے سینے سے اٹھا کر اسے دیکھنے لگی۔ سمریز اسے دیکھ کر ہلکا سا مسکرایا وہ بھی ہلکا سا مسکرا کر دو قدم پیچھے ہوئی۔

سمریز نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا جسے اس نے بروقت ہی تھام لیا۔ وہ اسے لے کر تھوڑے فاصلے پر موجود بینچ کی جانب بڑھا۔

"میں تمہیں کچھ دینا چاہتا ہوں۔" سمریز کی بات پر صلہ نے سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"مطلب کافی عرصے سے دینا چاہتا تھا مگر میں صحیح وقت کے انتظار میں تھا۔ اور مجھے لگتا ہے کہ اب وہ وقت ہے کہ مجھے تمہیں وہ چیز دے دینی چاہیے۔" سمریز کی بات پر صلہ کچھ حیرانی سے اسے دیکھنے لگی۔ ایسی کیا خاص چیز تھی جو وہ اسے صحیح وقت پر دینا چاہتا تھا؟ سمریز اسے وہیں بیٹھے چھوڑ اپنی گاڑی کی طرف بڑھا۔ سورج کی بکھرتی کرنوں میں موجود اس منظر میں صلہ تنہا بینچ پر بیٹھی رہی۔ اس راہ کو تکتی ہوئی جہاں سے وہ گیا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ واپس آتا دکھائی دیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا سرخ رنگ کا ڈبہ تھا۔

Clubb of Quality Content

وہ مسکراتا ہوا واپس اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ سورج کی کرنوں میں روشن وہ منظر اب مکمل سا لگنے لگا۔

اس نے وہ سرخ رنگ کا ڈبہ صلہ کے سامنے کیا اور دوسرے ہاتھ سے کھولا۔ صلہ نے پہلے اس چیز کو پھر سمریز کو دیکھا۔ سمریز کی آنکھوں میں الوہی سی چمک تھی۔ ایسی چمک کے صلہ مبہوت رہ گئی۔

بھلا کوئی صرف ایک چھوٹے سے موتی کو دیکھ کر اتنا خوش کیسے ہو سکتا تھا؟ مگر وہ ہو رہا تھا اور اس کے چہرے پر یہ خوشی بہت کم ہی دیکھنے کو ملتی تھی۔

"جانتی ہو یہ موتی بہت قیمتی ہے۔ میں ایک بار تمہارے بابا کے ساتھ بزنس ٹوئر پر گیا تھا۔ وہاں سمندر کنارے بکتے ڈھیروں موتیوں میں یہ واحد موتی تھا جو سالوں کی تلاش کے بعد لوگوں کو ملتا ہے۔ میں نے تب یہ موتی خرید لیا تھا۔" وہ ایک لمحے کو رکا نگاہ اٹھا کر صلہ کو دیکھا۔ بکھرتی روشنی کی کرنوں میں وہ بہت حسین لگ رہی تھی۔

"یہ میں نے اس انسان کیلئے لیا تھا جو میری زندگی کا سچا ہمسفر بنے گا۔" پھر بولا تو اس کی آواز میں دنیا جہاں کی مٹھاس سما گئی تھی۔ صلہ چونکی تھی۔

"اور مجھے لگتا ہے کہ تم اس موتی کی حقدار ہو۔ تم نے واقعی ساتھ نبھایا ہے۔" صلہ کی آنکھیں ایک بار پھر نم ہونے لگیں۔ وہاں خوشی کی ایک لہر دوڑ چلی تھی۔ سمریز نے مسکراتے ہوئے وہ موتی ہاتھ میں اٹھایا۔ اس کے ساتھ سنہری سی چین جڑی تھی شاید سمریز نے اس موتی کا لاکٹ بنوا لیا تھا۔ اس نے چین کے دونوں کنارے آزاد کیے اور صلہ کی جانب دیکھا۔ جیسے اجازت چاہی ہو۔ صلہ نے نم آنکھوں اور مسکراتے لبوں سے سر ہلا کر اجازت دی۔ سمریز نے وہ چین اس کے گلے میں پہنا دی۔ وہ سفید موتی اس کی صراحی دار گردن کی زینت بڑھا گیا۔ سمریز نے انگلی کے پوروں سے اسے چھوا تبھی اسے اپنے ہاتھ پر نمی کا احساس ہوا۔ اس نے چونک کر اوپر دیکھا۔ صلہ کی آنکھیں دوبارہ برسنے لگی تھیں۔ سنہرا طلسم یکدم ٹوٹ گیا۔ سمریز سیدھا ہو بیٹھا۔ صلہ نے بھی ہاتھ کی پشت سے گال صاف کیے اور سامنے دیکھنے لگی۔

”جانتی ہو میں نے تمہارے لیے اس موتی کا انتخاب کیوں کیا؟“ وہ سمندر کو دیکھتے پوچھ رہا تھا۔ صلہ اسے دیکھتی رہی۔

”میں نے ایک بار پڑھا تھا کہ نر پینگوئن جب اپنے لیے کسی مادہ پینگوئن کا انتخاب کرتا ہے تو پورے سمندر کے چکر لگاتا ہے۔ اور اس مادہ پینگوئن کیلئے سمندر کا سب سے قیمتی موتی ڈھونڈ کر لاتا ہے۔“ سمریز نے گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھا۔

”پتہ نہیں یہ سچ ہے یا نہیں لیکن مجھے یہ بات بہت پیاری لگی۔ اور جب اس موتی پر نگاہ پڑی تو بس پہلا خیال ہی یہ آیا کہ میں بھی اپنی ہمسفر کو سب سے قیمتی موتی دوں گا۔“ وہ اس کی آنکھوں میں جھانک کر گھمبیر لہجے میں بول رہا تھا۔ صلہ نے بامشکل ہونٹ آپس میں پیوست کرتے ہوئے، اپنی بے ساختہ امڈ آنے والی ہنسی کو دبانے کی کوشش کی، مگر وہ زیادہ دیر اسے روک نہ سکی۔

پینگوئن؟ ریئلی؟ وہ زور سے ہنس دی۔

تم واقعی پینگوئن کی نقل کر رہے ہو؟ وہ چہرے پر ہاتھ رکھے مسلسل ہنس رہی تھی۔ سمریز خاموشی سے اسے تکنے لگے۔ سورج کی بکھرتی کرنوں میں اس کی جگمگاتی مسکراتی آنکھیں بے حد خوبصورت لگ رہی تھیں۔ وہ بس اسے دیکھتا رہ گیا۔ دوسری طرف صلہ کو سمریز کی مثال پر واقعی ہنسی آ رہی تھی۔ اسے معلوم تھا سمریز کو سمندر سے بے حد محبت ہے مگر وہ سمندر اور وہاں رہتی مخلوق سے اتنا انسپائر ہو گا یہ اسے اندازہ نہ تھا۔

ہاں تو کیا ہوا؟ پینگوئن کتنا کیوٹ ہوتا ہے یار۔ وہ پہلو بدلتا شرمندہ سا بولا۔

او ہو تو وہ کیوٹ ہوتا ہے۔ ویسے تم خود کو پینگوئن سمجھ رہے ہو یا پھر کیوٹ۔ وہ اسے چھیڑنے لگی۔ سمریز نے ایک بار پھر اس کے چہرے کی جانب دیکھا۔ ہنس ہنس کر صلہ کے گال سرخ ہونے لگے تھے۔ اس کا دل جیسے رک رک کر دھڑکنے لگا۔ یوں لگا جیسے وہ پہلی بار اس عورت کو دیکھ رہا ہو۔ وہ واقعی حسین تھی۔ اس کے دل نے آج محبت سے اقرار کیا تھا۔

اچھا اچھا بس، اب اتنا بھی کچھ فنی نہیں ہے اس میں۔ وہ معصوم سا منہ بناتا سر کھجانے لگا۔ پھر صلہ کے ہنستے چہرے کو دیکھ کر خود بھی ہنس دیا۔ کتنی ہی دیر وہ دونوں اس بات پر ہنستے رہ

گئے۔ ہنستے ہنستے ان کی آنکھوں میں نمی بھر گئی مگر وہ پھر بھی ہنستے چلے گئے۔ ساحل کی خاموشی میں سمندر کی لہروں کے شور کے بیچ صرف ان دونوں کی ہنسی کی کھنکھار گونج رہی تھی۔ جیسے یہاں اس سمندر کنارے محبت کی کشتی کو کنارہ ملا ہو۔ جہاں کسی کی محبت بچھڑی تھی وہاں محبت کی ایک نئی کہانی مکمل ہوئی تھی۔

کافی دیر بعد انہوں نے اپنی ہنسی پر قابو پایا۔ مسکراہٹ کے آثار اب بھی باقی تھے۔ چند لمحوں بعد صلہ اس کی جانب مڑی۔

میں مذاق کر رہی تھی۔ یہ موتی واقعی بہت خوبصورت ہے۔ صلہ نے اب کہ ذرا سنجیدگی سے کہا۔ چند لمحے دونوں کے بیچ خاموشی چھائی رہی۔ اس خاموشی کے بیچ دور سے آتی لہروں کا شور تھا اور اسی شور کے ساتھ محبت کی ہلکی ہلکی کھنک سنائی دے رہی تھی۔ کچھ دیر بعد صلہ نے دوبارہ بات کا آغاز کیا۔

”تو تم نے یہ ثناء کو کیوں نہیں دیا؟ تم تو اس سے محبت کرتے تھے نا؟“صلہ کا سوال اچانک تھا۔ سمریز نے جھٹکے سے سر اٹھایا، چند لمحے اسے دیکھتا رہا پھر نگاہیں جھکا لیں۔ وہ جیسے بولنے کیلئے الفاظ تولنے لگا تھا۔

”میں نے کافی بار اسے دینے کا سوچا۔ مگر نا جانے کیوں دل ہمیشہ روک دیتا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ نہیں ابھی وقت نہیں آیا۔“صلہ غور سے اسے سن رہی تھی۔

”جانتی ہو وہ میری محبت تھی مگر پھر بھی میں اس سے ہر بات شیئر نہیں کر پاتا تھا۔ صرف میں ہی تھا جو اس سے محبت کرتا تھا۔ ثناء نے کبھی مجھ سے محبت کی ہی نہیں۔ اس کیلئے یہ ایک رشتہ تھا جسے وہ نبھا رہی تھی مگر محبت جیسے احساس سے وہ ناواقف تھی۔ شاید اس نے زندگی میں بہت پریشانیاں دیکھی تھیں۔ کم عمری سے بہت سی ذمے داریاں اٹھالی تھیں۔ اس لیے وہ ہمارے رشتے کو بھی ذمے داری سمجھ کر نبھاتی تھی۔ محبت کرنی اسے آتی ہی نہیں تھی۔“اس کے لہجے میں تاسف تھا۔

”اور تم چاہتے تھے کہ کوئی تم سے محبت کرے، ہے نا؟“صلہ اسے بغور دیکھتے پوچھا۔

"ہاں... بالکل۔ مطلب کون نہیں چاہتا کہ اس سے محبت کی جائے۔ ویسے بھی کسی کو چاہنے سے زیادہ چاہے جانے کا احساس خوبصورت ہوتا ہے۔ میں ہمیشہ ثناء کی نظروں میں اپنے لیے محبت دیکھنا چاہتا تھا مگر..." اس نے نگاہ اٹھا کر بھوری آنکھوں میں دیکھا۔ وہاں ایک نرم سا تاثر تھا۔ "مگر مجھے وہ محبت ہمیشہ تمہاری آنکھوں میں دکھتی ہے۔ وہ ساتھ، وہ خیال، وہ احساس جو میں ہمیشہ ثناء کے ساتھ ڈھونڈتا تھا وہ مجھے تمہارے ساتھ نصیب ہوا ہے۔" اس نے صلہ کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں تھاما۔

"وہ صرف محبت تھی مگر تم میری زندگی کا سکون ہو۔ محبت نہ ملے تو زندگی گزر جاتی ہے لیکن اگر سکون نہ ملے تو زندگی جہنم بن جاتی ہے۔ اور تمہارے ساتھ نے میری زندگی کو جنت بنا دیا ہے۔ تم نے مجھے اور میرے بیٹے کو ایک نئی زندگی ایک مکمل گھر دے دیا ہے۔ شکریہ صلہ !اس نے صلہ کی پیشانی پر بوسہ دیا اور اپنی پیشانی اس کے ماتھے کے ساتھ ٹکا دی۔ صلہ جھینپ کر مسکرا دی۔

تم میری آزمائشوں کا صلہ ہو یار! آئندہ کبھی خود کو مجھ پر بوجھ نہ سمجھنا۔ وہ محبت بھرے لہجے میں بولا۔ وہ دونوں کچھ دیر مزید وہاں بیٹھے اور پھر کیفے کیلئے چل پڑے۔ صلہ کا دل کافی ہلکا ہو گیا تھا۔ اس نے زندگی بھر جس شخص کو چاہا تھا وہ شخص قدرت نے اس کو دے دیا تھا۔ اسے یکدم ہی اپنا آپ بہت قیمتی لگنے لگا۔

°°°°°°°°°°°°°°°°°°°°

"سر ڈاکٹر مراد آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔" وہ اپنے انڈر گراؤنڈ کاٹیج کے بڑے سے ڈائننگ ہال میں تنہا بیٹھا تھا، جب سراج نے آکر اسے اطلاع دی۔ ڈاکٹر مراد کے نام پر اس کا منہ کو جاتا نوالہ وہیں تھم گیا۔ اس نے نگاہ اٹھا کر اسے دیکھا۔ نیلی آنکھوں میں حیرانی در آئی تھی۔

"سر وہ آج فجر کے وقت ہی پاکستان پہنچے ہیں۔ آپ کو ہلفیتی لے جانے آئے ہیں۔" سراج کی بات پر میکال ہاتھ میں پکڑا چھری اور کانٹا پلیٹ میں پٹکتا پیچھے ہو بیٹھا۔ کھانے سے جیسے دل اُچاٹ ہوا تھا۔

چند لمحے بے چینی سے ہاتھ کی انگلی سے میز پر دستک دیتا رہا پھر سراج کی طرف دیکھا۔

"انہیں اس سب کی خبر کیسے ہوئی؟" اس کے لہجے میں غصہ در آیا تھا۔ جانتا تھا کہ میکال کا اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ آخر ڈاکٹر مراد کو پتہ کیسے چلا کہ پولیس کو میکال اور شاہد کے سیاہ اعمال کے بارے میں معلوم ہو گیا ہے۔ اور یہ بھی کہ پولیس ہر جگہ اس کی تلاش میں ہے۔ یہی وجہ تھی کہ میکال کو اپنا گھر چھوڑ کر یہاں اس انڈر گراؤنڈ کاٹیج میں رہنا پڑ رہا تھا۔ یہاں تک کہ وہ ملک چھوڑ کر بھی نہیں جا سکتا تھا کیونکہ پولیس نے اس کی تصویریں شہر کے ہر ٹرانسپورٹ سسٹم تک پہنچا دی تھیں۔ اور سچی بات تو یہ تھی کہ میکال ابھی جانا بھی نہیں چاہتا تھا۔ ایک کام ابھی باقی تھا اور جب تک وہ یہ کام نہیں نمٹا لیتا وہ واپس جانے والا نہیں تھا۔

"سر ڈاکٹر مراد نے فورس کیا تھا اس لیے بتانا پڑا اور دوسرا آپ کی سیکیورٹی کیلئے بھی..."

"میں کوئی دس سال کا بچہ نہیں ہوں جس کی سیکیورٹی کی تمہیں پرواہ ہے۔ اب تک ہر پلان میری عقل سے مکمل ہوا ہے۔ آگے بھی وہی ہو گا جو میں پلان کروں گا۔ آئندہ میری

novelsclubb@gmail
www.novelsclubb.com
IG: @novelsclubb

اجازت کے بغیر تم ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھاؤ گے۔ انڈرسٹینڈ!" میکال سخت لہجے میں بولا۔ سراج نے فوراً سر جھکا کیا۔

"یس سر!" وہ بس اتنا ہی بولا۔ میکال نے ضبط سے جبڑے بھینچے اور پھر اسے جانے کا اشارہ کرتا دوبارہ کھانے کی طرف پلٹا۔ وہ مسلسل اپنی ایک ٹانگ ہلاتا جلدی جلدی کھانا مکمل کرنے لگا۔ اس کے انداز میں کچھ عجیب سا تھا۔ یوں جیسے بیٹھے بیٹھے غصے کی لہر اس کے پورے وجود کو گھیرتی جا رہی ہو۔

ابھی اس نے چند لقمے ہی مزید لیے تھے کہ یکدم ہی ہاتھ مار کر سامنے پڑی ساری پلیٹیں زمین بوس کر دیں۔ پھر جھٹکے سے کھڑا ہوا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ڈائننگ ہال سے باہر نکل گیا۔

ooooooooooooooooo

کچھ دیر بعد وہ ایک کشادہ سے کمرے میں کھڑا تھا۔ کمرے کے سارے کرٹنز ہٹے ہوئے تھے اور روشنیاں کھڑکی سے چھن کر آتی، مختلف دھاریوں کی صورت میں فرش پر گر رہی تھیں۔ وہ عین بیچ و بیچ کھڑا تھا۔ کمرہ ہر طرح کے فرنیچر سے خالی تھا۔ وہاں صرف تین

چیزیں موجود تھیں۔ ایک کرسی، کینوس اور بے شمار تصویریں۔ تصویریں مختلف جسامت کی تھیں۔ کوئی دیوار گیر تو کوئی چھوٹی چھوٹی ایک ہی دیوار پر لگی، ان گنت۔

ان تصویروں میں صرف دو وجود بنے تھے۔ ایک لمبے بالوں والی عروہ اور ایک حجاب والی خاتون۔ وہی خاتون جس نے اس نیلی آنکھوں والے کو جنم دیا تھا۔ یہ دونوں اس کی زندگی کا اہم حصہ تھے۔ یہ دونوں اس کی زندگی کی واحد عورتیں تھیں۔ ایک نے جنم دیا تھا اور ایک نے جینا سکھایا تھا۔ اور اس ظالم دنیا نے دونوں کو ہی اس سے جدا کر دیا تھا۔

وہ شکستہ قدموں سے چلتا ایک تصویر کے پاس آٹھہرا۔ وہ عروہ کی تصویر تھی۔ میکال ہاتھ بڑھا کر اس کی تصویر کو چھوا۔ وہ ساری تصاویر اس نے خود بنائی تھیں اور یوں لگتا تھا جیسے عروہ حقیقت میں موجود ہو۔

"تم سب مجھے تنہا کیوں چھوڑ جاتے ہو۔ کیا میکال شاہنواز کا زندگی کی بہاروں پر کوئی حق نہیں۔ ہمیشہ مجھ سے ہی میرے رشتے کیوں چھینے جاتے ہیں؟ کیا قدرت کو مجھ پر رحم نہیں

آتا؟" وہ گردن ایک جانب ڈھلکائے رنجیدہ لہجے میں کہہ رہا تھا۔ اس کا ہاتھ دھیرے دھیرے عروہ کے چہرے سے ہوتا اس کے بالوں کو چھونے لگا۔

"آخر میکال سے اس کی زندگی کی ہر خوبصورتی کیوں چھینی گئی؟ کیا میرے لیے قدرت نے صرف بدصورت قسمت رکھی ہے؟ آخر میں نے ایسا کونسا گناہ کیا تھا یار جو میرے ساتھ خدا نے یہ سب کیا؟" وہ شکوہ کر رہا تھا۔ وہ آج خدا سے شکوہ کر رہا تھا۔ کیا خدا واقعی اپنے بندوں کے ساتھ زیادتی کرتا ہے؟ کیا میکال شاہنواز کے ساتھ زیادتی ہوئی تھی؟ اگر نہیں تو وہ ہمیشہ تنہا کیوں رہ جاتا تھا؟ کیا قدرت کو واقعی اس سے نفرت تھی؟

بھلا خدا نے کبھی اپنی کسی مخلوق سے نفرت کی ہے؟ اللہ تو پہاڑوں کے وسط میں چھپی اپنی چھوٹی چھوٹی مخلوق کو بھی رزق پہنچاتا ہے، تو کیا وہ واقعی اپنی اشرف المخلوقات میں پیدا کیے گئے اس بندے کو بھلا سکتا تھا۔ مگر میکال اس بات کو سمجھنے سے قاصر تھا۔

"عروہ تمہیں مجھ سے وہ بات چھپانی نہیں چاہیے تھی۔ اگر تم وہ بات نہ چھپاتیں تو کیا پتہ آج ہم ساتھ ہوتے؟ تمہاری ایک چھوٹی سی غلطی ہمیں جدا کر گئی۔ کاش! میں اس ہفتے ہلفیتی نہ

جاتا اور کاش میری واپسی پر تم مجھے ہر بات بتا دیتی۔ کاش! کاش! قدرت مجھ پر رحم کر دیتی۔ کاش! میرے ساتھ یہ سب نہ ہوا ہوتا۔ کاش! میرا باپ ہمیں چھوڑ کر پاکستان نہ آیا ہوتا۔"

وہ یکدم ہی ہاتھ اس کی تصویر سے ہٹاتا اپنے بالوں کو جکڑ گیا۔ اس کے ذہن میں یادوں کی بوچھاڑ ہونے لگی تھی۔ کتنی ہی باتیں ایسی تھیں جو اس کے ذہن کے گرد پھندا تنگ کرنے لگی تھیں۔ وہ زور زور سے اپنے بال نوچتا زمین پر بیٹھتا چلا گیا۔ بچپن سے اب تک بے شمار باتیں اس کے ذہن پر ہتھوڑے برساتیں اسے توڑنے لگی۔ اسے ایک ایک بات، ایک ایک لمحہ حفظ تھا۔ کیا تم میکال شاہنواز کی زندگی کے بارے میں جاننا چاہو گے؟ ہاں تو آؤ میرے ساتھ ترکی کے اس گاؤں میں جسے ہلفیتی کہا جاتا ہے۔ وہ جگہ جسے کارا گلاب یا سیاہ گلاب کی سرزمین کہا جاتا ہے۔

ترکی کا وہ چھوٹا سا گاؤں جو دریائے فرات کے کنارے واقع ہے۔ اس گاؤں کے ایک چھوٹے سے گھر میں چار سالہ میکال شاہنواز اپنے باپ شاہنواز اور اپنی ماں آسیا کے ساتھ رہتا تھا۔ شاہنواز اور آسیا خاتون نے پسند کی شادی کی تھی۔ شادی سے پہلے آسیا خاتون روزانہ کام کی

غرض سے شہر جایا کرتی تھیں۔ وہ اپنے باغیچے میں لگے ان کار اگل کے مختلف گلدستے بناتیں اور روزانہ شہر جا کر بیچ کر آتی تھیں۔ شاہنواز سے ان کی ملاقات یونیورسٹی کے ایک فنکشن پر ہوئی تھی۔ آسیا خاتون کو اس فنکشن کی ارینجمنٹ کا کام سونپا گیا تھا۔ شاہنواز جو ہمیشہ سے ایک ذہن طالب علم رہے تھے وہ سکالرز شپ پر پاکستان سے ترکی پڑھنے آئے تھے۔ انہیں ہمیشہ سے ایک چھوٹی سی نوکری اور چھوٹی سی فیملی کی طلب رہی تھی۔ ان کا ارادہ یہیں ترکی میں پڑھائی مکمل کر کے یہیں نوکری کرنے کا تھا۔ اس فنکشن میں جب ان کی آسیا خاتون سے ملاقات ہوئی تو انہیں ایک اپنائیت کا احساس ہوا۔ آسیا ایک فصیح اور ذہین عورت تھیں۔ وہ باقی لڑکیوں کی طرح چھوٹی چھوٹی باتوں پر برا نہیں مناتی تھیں وہ شاہنواز کو مکمل طور پر سمجھتی تھیں۔ اور شاید ان کی یہی عادت شاہنواز کو بار بار ان کی جانب کھینچ لے جاتی۔ آسیا سے ان کی تھوڑی بہت بات چیت آہستہ آہستہ دوستی میں بدلی اور اس کے بعد انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ وہ یہیں گھر بسائیں گے۔ جب انہوں نے آسیا سے بات کی تو وہ فوراً ہی مان گئیں۔ آسیا کے گھر والوں کو کوئی اعتراض نہ تھا اور شاہنواز نے اعتراض کے ڈر سے

اپنی فیملی کو اس بات سے بے خبر رکھا۔ اور یہی چیز ان کی سب سے بڑی غلطی ثابت ہوئی۔ جو صرف ان کی ہی نہیں ان کی نسل کی زندگی بھی برباد کر گئی۔

ان کی شادی کے ایک سال بعد ہی میکال اس دنیا میں آیا۔ اس نے نیلی آنکھیں اپنی ماں سے لی تھیں اور چہرے کے خدوخال اپنے باپ سے جبکہ ذہانت میں تو اس کے ماں باپ دونوں ہی ایک سے بڑھ کر ایک تھے۔ وہ بچہ اس وقت پورے گاؤں کا سب سے خوش قسمت بچہ مانا جاتا تھا۔ وہ پورے خاندان کا لاڈلا تھا۔ اس کا باپ اس پر جان چھڑکتا تھا اور میکال نے ایک خوبصورت ماحول میں پرورش پائی۔ جہاں صرف محبت ہی محبت تھی۔

مگر پھر ایک دن اس کے باپ کو جانا پڑا، واپس اپنے وطن، واپس اپنے جہاں، جہاں سے وہ آیا تھا۔ شاہنواز کے والد بسترِ مرگ پر تھے۔ شاہنواز کو اطلاع ملی تو وہ فوراً ہی پاکستان کیلئے روانہ ہو گئے۔ آسیا اور میکال نہیں جا سکے۔ اتنی جلدی ان کے پاسپورٹ نہیں بن سکتے تھے اس لیے شاہنواز اکیلے ہی پاکستان چلے گئے۔ وہ صرف چند دنوں کیلئے گئے تھے مگر کسی کو کیا پتا تھا کہ وہ کبھی لوٹ کر نہیں آئیں گے۔ ایک مہینہ تو وہ آسیا اور میکال کے ساتھ رابطے میں

رہے۔ دو مہینوں بعد وہ رابطہ کم ہونے لگا اور تیسرے ماہ تو جیسے رابطے کی ڈوری بالکل کٹ کر رہ گئی۔

آسیا سارا سارا دن موبائل پر نظریں جمائے رکھتیں۔ وہ روزانہ ڈھیروں کے حساب سے کالیں کرتیں مگر جواب ندارد۔ شاہنواز تو جیسے انہیں بھول گئے تھے۔

جب چھ ماہ تک بھی کوئی کال نہیں آئی تو آسیا نے خود پاکستان جانے کا فیصلہ کیا۔ وہ یوں ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہیں بیٹھ سکتی تھیں۔ انہوں نے اپنا ویزہ بننے کو دیا اور جس دن وہ پاکستان کیلئے نکلنے والی تھیں اس سے ایک دن پہلے شاہنواز واپس بلفیتی پہنچے۔ آسیا کتنی ہی دیر ان سے شکوے کرتی رہیں مگر دل کو راحت مل گئی تھی کہ شاہنواز صحیح سلامت واپس آ گئے ہیں۔

انہیں کیا پتہ تھا وہ یہاں ان کے سر پر قیامت برپا کرنے آئے تھے۔ میکال اس وقت چھوٹا تھا وہ بس ان سب حالات کو دیکھ رہا تھا سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ وہ بس دیکھ رہا تھا کہ اس کے بابا اتنے مہینوں بعد گھر لوٹے ہیں، اس کی ماں شکوہ کر رہی ہے اور پھر کچھ دیر بعد اس کے بابا نے اس کی ماما کو کوئی بات بتائی جسے سن کر اس کی ماما رونے لگی تھیں۔ وہ چلانے لگی تھیں،

بری طرح پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھیں۔ اس کے والد انہیں سنبھالنے کی کوشش کر رہے تھے مگر وہ غصہ کر رہی تھیں، اس کے بابا پر چلا رہی تھیں۔ اس کے بابا بھی اب چلانے لگے تھے۔ دونوں کا شدید جھگڑا ہوا اور پھر اس کے بابا چلے گئے۔ اس کی ماما کو روتا بلکتا چھوڑ کر گھر سے چلے گئے۔

میکال کمرے کے کونے پر گم صم سا بیٹھا اپنی ماں کو روتے دیکھتا رہا۔ وہ ادھ کھلے دروازے کو دیکھتا رہا اس آس سے کہ شاید اس کے بابا واپس آجائیں گے۔ وہ تو اس کی ماما سے اور اس سے بہت محبت کرتے تھے وہ واپس آئیں گے اور انہیں منالیں گے۔ پھر وہ انہیں ہمیشہ کی طرح دریا پر لے جائیں گے۔

مگر اس کا انتظار انتظار ہی رہ گیا۔ وہ ادھ کھلا دروازہ پوری رات یوں ہی کھلا رہ گیا۔ نہ اس کے بابا واپس لوٹے نا اس کی ماما کی آنکھوں سے بہتے آنسو کبھی خشک ہوئے۔ دریائے فرات کے کنارے بسے اس گاؤں کا وہ لڑکا ہمیشہ کیلئے تنہا رہ گیا۔ اس کا وہ گھر جہاں صرف مسکراہٹیں دکھتی تھیں وہاں اب ویرانی نے ڈیرے ڈال دیے تھے۔ آسیا نے دوبارہ سے اپنا

novelsclubb@gmail
www.novelsclubb.com
IG: @novelsclubb

پرانا کام، پھولوں کے گلدستے بنا کر بیچنا شروع کر دیا۔ میکال نے سکول جانا شروع کر دیا مگر وہ خلا جو شاہنواز نے ان کی زندگیوں میں چھوڑ دیا تھا وہ کبھی بھر نہ سکی۔ آسیا اپنی طرف سے پوری کوشش کرتی تھیں کہ ان کے بیٹے کو کسی چیز کی کمی محسوس نہ ہو مگر یہ جدائی انہیں اندر سے کھا رہی تھی۔ میکال کی ہر ضرورت پوری ہوتی مگر خواہشات پوری کرنے والا تو جیسے اس سے لاتعلق ہو چکا تھا۔ وہ دونوں ماں بیٹے ایک دوسرے کے ساتھ رہتے ہوئے بھی اندر کہیں گہری کمی کا شکار تھے۔ اور پھر ایک دن وہ کمی پوری کرنے والا لوٹ کر آیا۔

شاہنواز نے تقریباً ایک سال بعد ایک بار پھر ہلفیتی کا رخ کیا تھا۔ آسیا اور میکال کیلئے وہ دن کسی عید سے کم نہ تھا۔ اچانک ہی اس ویرانی میں بہار آئی تھی۔ میکال کی ضد پر شاہنواز انہیں دریا پر لے گئے۔ وہ ہمیشہ سے قدرت سے محبت کرتا تھا۔ قدرت کے نیلے اور ہرے رنگوں میں اس کی جان بسی تھی اور اس دن بھی وہ وہیں دریا کے نیلے پانی کے کنارے بیٹھے تھے

جب شاہنواز نے انہیں ایک اطلاع دی۔ ایک ایسی اطلاع جس نے میکال کے ننھے سے دل کو بری طرح توڑ کر رکھ دیا تھا۔

"بابا! اب آپ واپس تو نہیں جائیں گے نا؟" میکال شاہنواز کے ایک بازو سے لپٹا بیٹھا تھا۔ نگاہیں دریا میں بنتی ابھرتی لہروں پر جمی تھیں۔ شاہنواز خاموش رہے۔ ان کی خاموشی پر آسیس نے بھی نگاہ اٹھا کر شاہنواز کو دیکھا۔ ان کے چہرے پر ابھی بھی ہلکی ناراضگی کے آثار تھے۔ شاہنواز چار سال بعد لوٹے تھے آسیس کی ناراضگی اب جانے سے ہی جانی تھی۔

"بابا! بتائیں نا؟ اب آپ واپس تو نہیں جائیں گے نا؟" میکال نے ان کا بازو ہلکا سا ہلاتے ہوئے دوبارہ پوچھا۔ شاہنواز نے ایک گہری سانس بھری پھر نگاہیں خلا میں جمائے آہستگی سے کہنا شروع کیا۔

"بیٹا مجھے جانا ہو گا۔ تمہارے بابا مجبور ہیں وہ یہاں نہیں رہ سکتے۔ لیکن بابا آپ سے ملنے آتے رہیں گے۔" میکال کے ننھے سے دل میں تکلیف ابھری تھی مگر وہ اپنے آنسو اندر کہیں اتار

گیا۔ البتہ آسیا کی آنکھیں بہنے لگی تھیں۔ وہ جو ناراض سی بیٹھی تھیں ان کے کندھے پر سر ٹکا گئیں۔

"شاہنواز ایسی بھی کیا مجبوری ہے آخر؟ ٹھیک ہے آپ نے دوسری شادی کر لی ہے پر آپ اپنی دوسری بیوی کو بھی یہیں لے آئیں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ یا پھر ہمیں اپنے ساتھ لے جائیں۔" آسیا نے منت کی۔ شاہنواز کے چہرے پر بھی ہلکی تکلیف ابھری تھی۔

"ایسا نہیں ہو سکتا آسیس میں تم لوگوں کو وہاں نہیں لے جا سکتا اور نہ ہی انہیں یہاں لا سکتا ہوں۔ ثمرہ کو میری پہلی شادی کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔ میں اسے بتا کر ایک اور تکلیف نہیں دینا چاہتا۔" شاہنواز نگاہیں جھکائے کہہ رہے تھے اور آسیا تکلیف سے انہیں سن رہی تھیں۔

"اور ویسے بھی اس کی حالت ایسی نہیں کہ میں اسے ایسی کوئی بات بتا کر اذیت دوں۔ وہ میرے بیٹے کو جنم دینے والی ہے۔ میں اس کا مزید نقصان نہیں کرنا چاہتا۔" شاہنواز آگے بھی کچھ کہہ رہے تھے مگر میکال تو جیسے بیٹا لفظ پر اٹک گیا۔

"بیٹا۔ مگر بابا کا بیٹا تو صرف میں ہوں۔ کیا بابا کا کوئی اور بھی بیٹا ہے۔ کیا بابا اس کی وجہ سے ہمیں چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔" اس کے ننھے سے ذہن میں ڈھیروں خیالات جنم لینے لگے اور ہر خیال کے ساتھ ننھا سا دل جیسے اس دریا کی گہرائیوں میں ڈوبتا چلا جاتا۔ وہ دن تھا جب میکال شاہنواز نے پہلی بار نفرت کرنا سیکھی تھی۔ جب اس معصوم دل میں پہلی بار سیاہی کا دھبہ لگا تھا۔ جب اس کے معصوم دل نے راتوں کو دیر تک اس بیٹے کے مر جانے کی دعائیں مانگی تھیں جس کی وجہ سے اس کا باپ انہیں چھوڑ گیا تھا۔ مگر جانتے ہو کیا، شاہنواز کا وہ بیٹا اس دنیا میں آیا تھا۔ اسے اس دنیا میں آنا ہی تھا۔ کیونکہ ہر زمانے کے فرعون کیلئے ایک موسیٰ آتا ہی ہے۔

میکال نا جانے کتنی دیر اس کمرے میں بیٹھا دیوانہ وار چلاتا رہا۔ پرانی ہر یاد پر تڑپ کر شکوہ کرتا رہا۔ اپنی قسمت پر ماتم کر کر کے جب وہ بے حال ہو گیا تو نڈھال سا وہیں فرش پر گر گیا۔ بکھرے بالوں اور سرخ نگاہوں سے وہ چھت پر لگے فانوس کو تکنے لگا۔ اس کے جسم میں بے چینی ہونے لگی تھی۔ وہ غیر ارادی طور پر اپنی ہتھیلیاں فرش پر رگڑنے لگا۔

novelsclubb@gmail
www.novelsclubb.com
IG: @novelsclubb

یوں جیسے کسی چیز کی طلب ہو رہی ہو۔ ایسی طلب جو پوری نہ ہوئی تو شاید اس کی سانسیں بند ہو جائیں۔ اس کی سرخ نگاہوں میں بے چینی کے باعث وحشت ابھرنے لگی تھی۔ وہی وحشت جو ہمیشہ اسے ایک چیز کی طلب پر ہوتی تھی۔ وہ طلب تھی خون کی طلب۔ ایک اور قتل، ایک اور انتقام کی طلب۔

وہ جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اسے یہ طلب پوری کرنی تھی۔ وہ کھڑا گہری گہری سانسیں بھرنے لگا۔ ذہن جیسے کچھ سوچ رہا تھا۔ مگر پھر وہ دیوانہ وار چلا اٹھا۔ اس کے پاس اپنی طلب پوری کرنے کیلئے سب کچھ تھا مگر نہیں تھا تو بس ایک ہتھیار۔ اور جانتے ہو کون تھا اس کا ہتھیار؟ اس کا ہتھیار سمریز تھا جو اب اس کی مٹھی سے نکل چکا تھا۔ اور اسی خیال سے وہ پاگل ہو رہا تھا۔ وہ غصے میں چیزیں اٹھا کر زمین پر پٹخنے لگا۔ اسے یہ طلب پوری کرنی تھی کسی بھی حال میں نہیں تو شاید وہ واقعی دیوانہ ہو جاتا۔

ooooooooooooooooo

وہ لوگ تقریباً ایک ساتھ ہی کیفے آ کر رکے تھے۔ صلہ اور سمریز کی گاڑی آگے تھی اور تابش وغیرہ کی گاڑی پیچھے رکی تھی۔ صلہ باہر نکلی تو پیچھے سے میرب اور مریم کو بھی نکلتے دیکھے۔ ایک لمحے کیلئے وہ چونکی مریم صبح صبح ان لوگوں کے ساتھ، دوسری چیز جس پر وہ چونکہ تھی وہ یہ کہ میرب کے چہرے پر بڑی سی مسکراہٹ کھلی تھی۔ اسے یقین کرنے میں فوت ہونے لگی کہ واقعی میرب مریم کے ساتھ اتنا مسکرا رہی ہے۔ صلہ خود ان کی جانب بڑھی۔ تب تک سمریز بھی باہر نکل آیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں صلہ کا پرس تھا جسے وہ گاڑی میں ہی بھول آئی تھی۔ سمریز کو دیکھ تابش بھی گاڑی سے اتر گیا۔

دی ڈونیٹ گیلور کے گلاس ڈور کے سامنے وہ کچھ اس طرح کھڑے تھے کہ صلہ اور سمریز دائیں جانب اور وہ تینوں بائیں جانب کو ایک دوسرے کے مقابل تھے۔

میرب شمال سے جنوب تک کھلی اپنی مسکراہٹ کے ساتھ آگے بڑھی۔ ہاتھ میں پکڑے پلاسٹک بیگ سے مٹھائی کا ڈبہ نکالا۔

"مبارک ہو بھئی، مبارک ہو۔ وہ جوش سے کہتی ڈبے میں سے مٹھائی نکال کر صلہ کے منہ میں ٹھونس گئی۔

"ارے! پر کس چیز کی مبارک باد؟" صلہ بامشکل پورا گلاب جامن نگلتی بولی۔ میرب اب سمریز کے سامنے ڈبہ کھولے کھڑی تھی۔

"تمہاری دوست اور میرے بھائی کی شادی کی مبارک باد۔" میرب کی چہکتی آواز پر سمریز اور صلہ دونوں کو اچھو لگا۔ منہ میں رکھی مٹھائی نگلنا مشکل ہو گیا۔

"مطلب؟" صلہ بے یقینی سے بولی۔ سمریز نے آنکھیں پوری کھولے تابش کو دیکھا۔

"مطلب یہ کہ تمہاری دوست اور میرا بھائی ایک نمبر کے میسنے نکلے۔ ہماری ناک کے نیچے بات شادی تک پہنچ گئی تھی اور ہم تھے کہ انجان رہے۔ اور دیکھو ہمارے انجان رہنے کا نتیجہ، یہ میرا شریف اور شرمیلا بھائی بنا بتائے لڑکی سے نکاح پڑھ کر گھر آ گیا۔" "لیکن تم بھی فکر مت کرو امی نے اچھی درگت بنائی ہے اس کی۔" میرب اپنے ازلی شوخ انداز میں بولتی چلی جا رہی تھی۔ مریم اور تابش تو اس کی باتوں پر شرمندہ سے ہونے لگے۔

"ارے تابش میاں تم تو واقعی میسنے نکلے۔ مجھے کہا کہ بڑے ہی ضروری مشن پر لگے ہوئے ہو، مجھے کیا پتہ تھا کہ وہ ضروری مشن محبت پانے کا تھا۔"سمریز نے بھی اپنا حصہ ڈالا۔ تابش تو بیچارہ سا منہ بنا گیا۔

"نہیں سر! میں مشن پر ہی گیا تھا۔ وہ بس..."اتنا کہتا وہ سر کھجانے لگا۔

"ہاں! ہاں! مشن کے بیچ میں ایک حسین دوشیزہ آپ کا دل چرا لے گئی۔ یہی کہنا چاہ رہے ہیں آپ؟"صلہ بھی آگے بڑھ آئی۔

"صلہ!"مریم نے فوراً ہی اسے ٹوکا مگر صلہ بھی رکنے والی نہیں تھی فوراً تنک کر بولی۔

"تم تو چپ رہو میں نے کہا تھا کہ ہم دونوں تابش بھائی کی شادی کے گلاب جامن کھائیں گے مگر یہاں تو تم پورے کے پورے تابش بھائی ہی اڑا لے گئیں۔"اس نے ساری بندوقوں کا رخ مریم کی جانب پھیر لیا۔ صلہ کی بات پر وہ سب کھل کر ہنس دیے۔ جبکہ مریم سب کی نگاہوں کا مرکز بننے پر جھینپ سی گئی۔

کچھ دیر کی مزید ہنسی مذاق کے بعد وہ سب اپنے اپنے کاموں پر لگ گئے۔ البتہ صلہ اور میرب نے مریم کو پورا دن ہی نہیں بخشا تھا۔ وہ ہر چھوٹی چھوٹی بات پر اسے چھیڑنے کا فرض اچھی طرح نبھاتی رہیں۔

اور مریم بیچاری شرمندہ سی ان کی باتوں سے بچنے کی ناکام کوشش کرتی رہی۔

ooooooooooooooooo

رات کا آدھا پہر تھا جب اسے نیند میں پیاس کا احساس ہوا۔ وہ اٹھ کر بیٹھی اور بستر سے اتر کر دروازے کی جانب بڑھی۔ تبھی اسے احساس ہوا کہ بستر پر اس کے سوا اور کوئی موجود نہیں۔ اس نے فوراً باتھ روم کی جانب دیکھا مگر وہاں کی لائٹ آف تھی۔

”تابش کہاں چلے گئے اتنی رات کو۔“ وہ پریشانی سے بڑبڑائی پھر دوپٹہ درست کرتی باہر بڑھی۔ ٹی وی لاؤنج میں اندھیرا چھایا ہوا تھا مگر سٹور روم سے روشنی کی ہلکی سی جھلک دکھائی دے رہی تھی۔ وہ پہلے تو چند لمحے اسی کشمکش میں کھڑی رہی کہ آگے جا کر دیکھے یا نہیں مگر پھر ہمت کرتی آگے بڑھی۔ سٹور روم کے دروازے پر کھڑے ہو کر وہ دستک

دینے سے پہلے چند لمحے سوچتی رہی۔ کیا تابش اندر ہوں گے؟ کیا مجھے دیکھنا چاہیے؟ کہیں وہ غصہ تو نہیں کریں گے؟ یکدم ہی جیسے ماضی کی ایک یاد اس کے ذہن کے پردے پر لہرائی۔ وہ وقت جب وہ اپنے پہلے شوہر کی اجازت کے بغیر اس کے آفس روم میں داخل ہو گئی تھی۔ اور اس کے بعد اس شخص نے اسے بالوں سے پکڑ کر باہر نکالا تھا۔ خوف کی ایک سرد سی لہر اس کے پورے جسم میں دوڑ گئی۔ ابھی وہ واپسی کیلئے قدم اٹھانے ہی والی تھی کہ یکدم ہی سٹور روم کا دروازہ کھلا۔ تابش کو باہر آتا دیکھ مریم کی سانس اٹک گئی۔ تابش بھی اس لمحے مریم کو وہاں کھڑا دیکھ کر چونکا تھا۔ سٹور سے آتی ہلکی روشنی میں دونوں کی نگاہیں ملیں۔ دونوں کی نگاہوں میں ہی نمی سی تھی۔

”وہ... ایم سوری! میں... میں بس جا رہی تھی۔ میں غلطی سے آ گئی۔“ مریم کی لرزتی آواز اور ہاتھوں کی کپکپاہٹ دیکھ تابش کے ماتھے پر بل پڑے۔

”کیا ہو گیا آپ گھبرا کیوں رہی ہیں؟“ اس نے آگے بڑھ کر مریم کے کندھوں پر ہاتھ رکھا۔

”جی، میں... وہ آپ کمرے میں نہیں تھے نا... تو میں پریشان ہو گئی تھی۔“ مریم نے خشک ہوتے لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے بات بنائی۔ تابش غور سے اسے دیکھتا رہا۔ مریم کا رویہ اسے کچھ کھٹکا تھا۔ لیکن اس نے رات کے اس پہر بات کو مزید طول نہ دینا ہی بہتر سمجھا۔ تابش نے ہلکے سے اس کا کندھا تھپکا اور اس کا ہاتھ تھامے آگے بڑھ گیا۔

کچھ دیر بعد وہ دونوں کچن میں موجود ڈائننگ ٹیبل کے گرد بیٹھے تھے۔ تابش اسے پانی پیتے دیکھ رہا تھا۔ وہ پانی پی کر فارغ ہوئی اور گلاس سامنے میز پر رکھ دیا۔ چند لمحے خاموشی رہی پھر مریم نے دھیرے سے بولنا شروع کیا۔

”آپ اتنی رات کو یہاں کیا کر رہے تھے؟ میں پریشان ہو گئی تھی کہ نا جانے آپ کہاں چلے گئے ہیں اتنی رات کو۔“ اس کی بات پر تابش ہلکا سا مسکرایا پھر آگے ہو بیٹھا۔ مریم اسے بغور دیکھ رہی تھی۔ تابش کی آنکھوں کی نمی تو خشک ہو چکی تھی مگر وہاں آنسوؤں کے بعد والی سرخی باقی تھی، اور یہی وجہ تھی کہ مریم کو پریشانی ہو رہی تھی۔ کیا وہ رویا تھا؟ لیکن کیوں؟ یہ

سوال اسے اندر ہی اندر پریشان کر رہا تھا۔ تابش چند لمحے اسے دیکھتا رہا، چہرے پر پھیلی ہلکی سی مسکراہٹ آہستہ آہستہ معدوم ہوتی چلی گئی۔ پھر وہ سر جھکا گیا۔

"بس بابا کی یاد آ گئی تھی۔" وہ آہستہ آواز میں بولا لیکن خاموشی ہونے کے باعث مریم اسے سن سکتی تھی۔

"جانتی ہو میرے بابا نے اپنی زندگی میں بہت مشکلات دیکھی تھیں۔" آنسوؤں کا ایک گولا اس کے حلق میں اٹک گیا۔

"میں اور میرب بہت چھوٹے تھے جب وہ ہمیں چھوڑ کر چلے گئے۔ ہماری زندگیاں ادھوری رہ گئیں۔ ہمارے تایا نے ہمیں حویلی سے نکال دیا۔ ہم سڑک پر آ گئے۔ میری ماں ہمیں لے کر نانا کے گھر چلی گئی لیکن مامی نے وہاں بھی زیادہ دن برداشت نا کیا۔ تب زندگی میں پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ ماں باپ کے بغیر اولاد کی کوئی زندگی نہیں۔ تب مجھے ماں کے قدموں میں جنت اور باپ کی رضا میں خدا کی رضا ہونے کا مطلب باخوبی معلوم ہو گیا۔ بس اسی لیے جب بھی بابا کی یاد آتی ہے تو سٹور روم میں پڑی ہماری چند ایک

تصویریں دیکھ کر دل بہلا لیتا ہوں۔" اس کی آنکھیں ایک بار پھر نم ہوئی تھیں۔ وہ خاموش ہو گیا۔

"آپ کے تایا نے آپ کو کیوں نکال دیا تھا؟" مریم نے سوال کیا۔

"جائیداد کے چکر میں، انہیں معلوم تھا ہمارے پیچھے کوئی نہیں جو آ کر ان سے حق مانگے گا۔ انہوں نے ہمیں گھر سے نکال دیا اور بابا کی ساری جائیداد خود ہڑپ لی۔" مریم اسے بغور سنتی رہی۔

"کسی قانون، کسی عدالت نے ہمارا ساتھ نہیں دیا۔ میری ماں نے اپنے بل بوتے پر ہمیں پال پوس کر بڑا کیا۔ اور پتہ ہے میں پولیس میں بھی اسی لیے آیا تھا۔ قانون نے ہمیں تنہا چھوڑا تو میں نے خود قانون کا کارندہ بننے کا سوچا۔ ہمیں کسی نے انصاف نہیں دلوایا تو میں نے لوگوں کو انصاف دلوانے کی ٹھان لی۔ لیکن یہ بہت مشکل ہے۔ ہم چاہے مجرم کو پکڑ ہی کیوں نا لیں مگر عدالت انہیں آزاد کر دیتی ہے۔ تابش کی آنکھوں میں گہری سنجیدگی ابھری تھی۔ جیسے کوئی راز اس کی آنکھوں میں جھلکا ہو مگر وہ اسے چھپا گیا۔

لگتا ہے آپ اپنے بابا سے بے حد محبت کرتے ہیں؟ وہ بھی آپ لوگوں سے ہوں ہی محبت کرتے ہوں گا نا؟ وہ ہاتھ کی مٹھی ٹھوڑی تلے رکھے دل سہی سے پوچھنے لگی۔ وہ ہمیشہ ماں باپ کے پیار سے محروم رہی تھی یہ ٹاپک اس کا پسندیدہ تھا۔ مریم کے پوچھنے پر وہ تلخی سے ہنسا۔

”میرے بابا نے کبھی ہم سے محبت نہیں کی۔ ان کو ہم سے کبھی لگاؤ نہیں رہا تھا۔“ مریم کے ماتھے پر الجھن سی بکھری۔

”مریم! میرے بابا نے میری امی سے صرف ایک مجبوری کے تحت شادی کی تھی۔ دادا نے خاندانی بہو لانے کیلئے بابا کو مجبور کیا۔ ان دونوں کی آپس میں کبھی بھی نہیں بنی۔ پہلے پہل امی کو ان کا رویہ سمجھ نہیں آتا تھا۔ پھر وہ عادی ہو گئیں لیکن بابا کے جانے کے بعد معلوم ہوا کہ وہ پہلے سے شادی شدہ تھے۔ وہ رہتے ہمارے ساتھ تھے مگر ان کا دل، ان کی توجہ صرف اپنی پہلی بیوی اور اولاد کی جانب تھی۔ وہ عیدوں پر، خوشی کے موقعوں پر ہمیں چھوڑ ان کے پاس جاتے تھے۔ ہمیں علم تک نہیں ہونے دیا کبھی۔ دیکھا جائے تو بہت سے شکوے

ہیں بابا سا لیکن پھر بھی وہ سائبان تھے۔ ان کے جانے کے بعد سب ختم سا ہو گیا۔" مریم اس کا درد سمجھ سکتی تھی۔ وہ دونوں ہی تھے جو ایک دوسرے کی تکلیف جانتے تھے۔ مریم نے اس کے بازو پر اپنا ہاتھ رکھا۔ دھیرے سے تسلی دی گئی۔ مریم نے تابش کا یہ رخ آج پہلی بار دیکھا تھا۔ وہ شخص جو ہر وقت چہرے پر مسکراہٹ سجائے رکھتا تھا، وہ اندر سے کتنا بکھرا ہوا تھا۔ وہ اسے دیکھتی رہ گئی۔

تابش نے بوتل سے پانی گلاس میں انڈیلا اور منہ کو لگالیا۔ دل پر پڑا بوجھ بانٹنے سے کچھ ہلکا ہوا تھا مگر وہ خلا کبھی پُر نہیں ہو سکتی تھی۔

وہ دونوں کافی دیر وہیں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔

○○○○○○○○○○○○○○○

"آجاؤ جلدی! انیکس ریڈی ہیں۔" وہ دونوں ہاتھوں میں شیشے کے باؤل اٹھائے کمرے کے دروازے سے جھانک کر بولی۔ عالیان اور سمریز بیڈ روم میں صوفے پر بیٹھے تھے۔ سمریز لیپ ٹاپ پر کچھ کام کر رہا تھا۔ اس کی آواز پر دونوں نے نگاہیں اٹھا کر دیکھا۔

"سمریز! تم نے مووی ڈیسائیڈ کرلی نا؟ اور عالیان سارے تکیے اور کشن ٹی وی لاؤنج میں رکھ لیا نا؟" وہ جلدی جلدی بولتی دونوں سے پوچھنے لگی۔

"ہاں کرلی مائے لو!" سمریز نے خوبصورت سی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔

"جی ماما میں نے سارے تکیے اور سارے کشن جمع کرلیے۔ اب گھر بنائیں نا جلدی۔" عالیان بھی فوراً بولا۔ صلہ ہلکا سا مسکرائی۔

"ہاں نا بالکل، جلدی سے آجاؤ ہم پیارا سا گھر بناتے ہیں۔ اور سمریز تم بھی جلدی آؤ اور اپنا فون سائلنٹ پر کر کے آنا۔ بلکہ میں تو کہتی ہوں الماری میں رکھ کر آنا۔ خبردار جو ساتھ لائے۔" وہ انگلی اٹھاتی وارن کرنے والے انداز میں بولی۔

"جو حکم جناب! آپ کہیں تو ہمیشہ کیلئے ڈسپوز آف کردوں۔" وہ فرمانبرداری سے بولا۔

ہاں! ہاں! اتنے تم فرمانبردار! بس آج کیلئے سائلنٹ کردو اتنا ہی بہت ہے۔" اس کی بات پر سمریز سر جھکا کر ہنس دیا۔ صلہ مسکراتے ہوئے باہر بڑھ گئی۔

عالیان بھی ہاتھ میں اپنا بڑا سا ٹیڈی اٹھائے اس کے پیچھے بھاگا۔

آج ویک اینڈ تھا۔ اس لیے آج ان تینوں نے فیملی ٹائم سپینڈ کرنے کا پلان بنایا۔ عالیان کے کہنے پر وہ تینوں مووی دیکھنے والے تھے۔

عالیان اور صلہ نے مل کر ایل ای ڈی کے سامنے سارے گھر کے تکیے اور کشن سجا کر رکھے۔ جسے انہوں نے گھر کا نام دیا تھا۔ سب سنیکس، جوس، اور کھانے پینے کی بہت سی اشیاء ٹیبل پر سجا کر سامنے رکھی تھیں۔ سمریز نے آکر اپنے لیپ ٹاپ کو ایل ای ڈی سی کنیکٹ کیا پھر ان دونوں کے بیچ آکر بیٹھ گیا۔

"سو ریڈی!" اس نے ریموٹ ہاتھ میں گھماتے پوچھا۔

"یس! اب چلاؤ بھی! چلائیں نا بابا!" وہ دونوں بے صبری سے بولے۔

"اوکے! اوکے!" وہ ان کی بے صبری پر ہنسا ساتھ ہی مووی آن کی۔ وہ تینوں ایک پرفیکٹ فیملی کی طرح ہشاش بشاش سے زندگی کے لمحات جینے لگے۔ اس بات سے بے خبر کے جلد ہی یہ لمحات بھی گزرنے والے تھے۔

ایک سیاہ بی ایم ڈبلیو کشادہ سڑک پر دوڑتی چلی جارہی تھی۔ سڑک کے اطراف میں بڑے بڑے درخت لگے تھے۔ کچھ آگے جا کر سڑک کی دائیں جانب موجود درختوں کے بیچ سے ایک مزید راستہ نکل رہا تھا۔ وہاں سڑک نہیں تھی لیکن کچی مٹی سے راستے کا نشان بنا تھا۔ شاید وہاں سے اکا دکا گاڑیاں آتی جاتی تھیں۔ تبھی وہ سیاہ بی ایم ڈبلیو بھی سڑک چھوڑ درختوں کے بیچ بنے اس راستے کی جانب بڑھ آئی۔ وہاں بڑے بڑے کھلے میدان تھے اور پھر کچھ ہی دیر میں وہ گاڑی جنگل نما حصے میں داخل ہوئی۔ وہ جگہ شہر سے بہت دور تھی اور گھنے درختوں کے بیچ سے گزرتے ہوئے اس گاڑی نے ایک جگہ آکر بریک لگائی۔ بی ایم ڈبلیو کی پچھلی نشست کا دروازہ کھلا اور سفید پینٹ کوٹ میں ملبوس ایک شخص باہر آیا۔ وہ کافی دراز قد تھا۔ بال ہلکے سنہرے اور رنگت صاف تھی۔ اس نے باہر نکل کر آنکھوں پر لگا چشمہ اتارا اور سامنے موجود بنگلے پر نگاہ ڈالی۔ اس کی آنکھیں ہلکی سرمئی رنگ کی تھیں۔ جن میں سختی رچی بسی تھی۔ اس کے ماتھے پر شکنیں ابھریں۔ اس گھر کے باسی کی ہٹ دھرمی سے وہ تنگ آچکا تھا۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا اندر کی جانب بڑھا۔

وہ ہلکی سرمئی آنکھوں والا سیدھا چلتا گھر کے اندر داخل ہو گیا۔ کسی نے اسے نہیں روکا تھا۔ یہاں کوئی اسے نہیں روک سکتا تھا۔ وہ اندر پہنچا تو سامنے ہی ایک بڑے سے ہال میں داخل ہوا۔ اس ہال کمرے کے بیچ و بیچ گرے رنگ کا ایل شیپ صوفہ رکھا تھا۔ دیواروں پر لگی مختلف پینٹنگز اور لکڑی کے فرش پر بچھے میٹس ہر چیز اپنی قیمت کا منہ بولتا ثبوت تھی۔ وہ شخص بنا کسی چیز پر دھیان دیے آگے بڑھا۔ اس بڑے ہال روم کے بائیں جانب سیڑھیاں بنی تھیں جو نیچے کی جانب جاری تھیں۔ وہ شخص سیڑھیاں اترتا نیچے پہنچا۔ وہاں تہہ خانہ سا تھا۔ اس تہہ خانے میں ایک ہلکے زرد رنگ کی روشنی جل رہی تھی اور اس روشنی میں ایک وجود واضح دکھائی دے رہا تھا۔ سیاہ ٹی شرٹ اور بیگی پینٹ میں ملبوس وہ میز پر رکھے ایک ہی طرح کے ڈھیروں چاقو صاف کر رہا تھا۔

قدموں کی چاپ پر میکال کا چاقو صاف کرتا ہاتھ تھم سا گیا۔

کافی وقت بعد سمریز نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ رات کے تقریباً ایک بجے رہے تھے۔

سمریز نے ایک نگاہ ان دونوں پر ڈالی۔ صلہ اس کے دائیں کندھے پر اور عالیان اس کے

بائیں بازو پر سر ٹکائے گہری نیند میں اتر چکے تھے۔ سمریز کی نگاہوں کا نرم تاثر پل میں ختم ہوا۔ اب ان شہد رنگ آنکھوں میں سنجیدگی سی بھر گئی تھی۔ وہ سنجیدگی معمولی نہیں تھی اس کے پیچھے ایک وحشت سی چھپی تھی۔

اس نے آہستگی سے صلہ کا سر اپنے کندھے سے ہٹا کر صوفے کے بازو سے ٹکا دیا۔ ساتھ ہی اپنے بازو پر لیٹے عالیان کو کشن سیٹ کر کے نرمی سے سیدھا کر کے لٹایا۔ پھر وہ آہستگی سے کھڑا ہوا۔ رک کر چند لمحے ان دونوں کو دیکھتا رہا پھر چند قدم اٹھا کر وہ صلہ کی جانب آیا۔ اس کے بھورے بال چہرے پر آرہے تھے۔ وہ ایک گھٹنے کے بل اس کے ساتھ بیٹھا گیا۔

سمریز کی آنکھوں کا تاثر پل میں نرم ہوا۔ اس نے دھیرے سے ہاتھ بڑھا کر بال اس کے کان کے پیچھے اڑسے۔

”ایم سوری، صلہ! میں یہ نہ کرتا لیکن یہ سب انصاف کیلئے ہے۔ میرے ہوتے ہوئے مجرم آزاد پھر تا رہے یہ مجھے منظور نہیں۔ مجھے معاف کر دینا مائے لو!“ وہ دکھی دل سے بولا۔ صلہ

اس کی باتوں سے انجان گہری نیند میں ڈوبی رہی۔ وہ چند لمحے اسے نرم تاثر کے ساتھ دیکھتا رہا پھر دھیرے سے قدم بڑھاتا گھر سے باہر نکل گیا۔

”ڈاکٹر مراد!“اس کے لبوں نے دھیرے سے حرکت کی۔ وہ اس چاپ کو پہچانتا تھا،اور یہاں آنے کی اجازت بھی صرف ڈاکٹر مراد کو ہی تھی۔ میکال نے مڑ کر ہلکی سرمئی نگاہوں میں دیکھا۔ چہرے پر آسودہ سی مسکراہٹ پھیلی۔

”آپ؟“وہ بڑے بڑے قدم لیتا اس کی جانب بڑھا۔ دونوں بازو پھیلائے جیسے ہی وہ ان کے قریب پہنچا ڈاکٹر مراد نے اس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر اسے پیچھے کیا۔ میکال کی آسودہ سی مسکراہٹ معدوم ہوئی۔ نیلی آنکھوں میں حیرت پھر بے یقینی پھیلی۔ یہ پہلی بار تھا کہ ڈاکٹر مراد نے اسے جھٹکا تھا، نہیں تو وہ ہمیشہ سے پہلا شخص رہا تھا جو اسے خود آگے بڑھ کر گلے لگاتا تھا۔

novelsclubb@gmail
www.novelsclubb.com
IG: @novelsclubb

"میں نے تمہیں بلایا تھا میکال؟" ڈاکٹر مراد اس کی بے یقین نگاہوں میں غور سے دیکھتے سنجیدگی سے سوال کرنے لگے۔ میکال نگاہیں جھکا گیا۔ ڈاکٹر مراد نے اس کی حالت دیکھی۔ بکھرے بال، آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے اور ٹوٹی حالت۔ ان کا دل پسیج سا گیا۔

"تم جانتے بھی ہو باہر ہو کیا رہا ہے۔" ڈاکٹر مراد کی آنکھوں میں یکدم ڈھیروں پریشانی آگھری تھی۔ میکال کی خاموشی انہیں مزید تپانے لگی۔

وہ فلیٹ سے نکلتا سنسان سڑک پر قدم آگے بڑھانے لگا۔ تیز ہوا کے دوش پر اس کے بال بکھرتے چلے گئے۔ وہ اس تیز ہوا کے مخالف سمت میں چلتا جا رہا تھا۔ بالکل ایسے ہی جیسے ایک اکیلا انسان دنیا کی تلخیوں کا سامنا کرتا آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ وہ پہلے دن سے دنیا کا مقابلہ کر رہا تھا اور وہ آج بھی اسی مقابلے پر نکلا تھا۔

لوگوں نے اپنے فائدے کیلئے اس کا استعمال کیا تھا، اسے بہت نقصان پہنچایا تھا مگر وہ اپنے ہر نقصان کی بھرپائی کرنا جانتا تھا۔

اس کے دشمنوں نے اسے ہر معاملے سے غافل رکھ کر استعمال کیا تھا۔ آج وہ ان سب کو غفلت میں رکھ کر اپنے مقصد کے قریب پہنچ رہا تھا۔ کیونکہ وہ ذہین تھا، وہ ہار سکتا تھا مگر ہارے نہیں رہ سکتا تھا۔ وہ تب تک آٹھ سکتا تھا جب تک ہار کو ہرا نہ دے۔

”میکال میں نے تمہیں ہمیشہ سپورٹ کیا۔ تم نے کہا تھا کہ تم اپنا حق واپس لو گے میں نے تمہارا ساتھ دیا۔ تمہیں ڈاکٹری کی ڈگری دلوائی۔ تمہیں ہپناٹزم سیکھایا۔ ہر غیر قانونی کام میں تمہارا ساتھ دیا۔ تم نے عروہ کی غلطی کی وجہ سے ہونے والے نقصان کا بدلہ لینا چاہا میں نے تب بھی تمہارا ساتھ دیا۔“ عروہ کے نام پر میکال کے دل میں کچھ ٹوٹا تھا۔

”میں نے تمہارے ہر قتل میں تمہارا ساتھ دیا۔ تمہارے پلان کو مکمل کرنے کیلئے پوری ٹیم دی مگر اب بس۔ اب بہت ہو گیا میکال۔ جب تک تم پولیس کی نظروں سے اوجھل تھے میں تمہارے ساتھ دیتا رہا۔ مگر اب پولیس کو سب معلوم ہو چکا ہے۔ اب میں مزید تمہیں اس سب میں پھنسنے نہیں دے سکتا۔ تمہیں ابھی اور اسی وقت میرے ساتھ چلنا ہو گا۔“ ڈاکٹر مراد نے حتمی فیصلہ سنایا۔

"صرف ایک قتل اور، صرف ایک بدلہ اور..."

"اگر اب تم نے میری بات نہ سنی تو میں تمہارا قتل کردوں گا میکال۔ تم ابھی میرے ساتھ چل رہے ہو بس!" ڈاکٹر مراد نے اس کی بات بیچ میں کاٹ دی۔

"آپ جانتے ہیں میں نہیں مانوں گا۔" وہ بھی ڈھٹائی سے بولا۔ ڈاکٹر مراد کے سامنے اس مغرور شہزادے کا لہجہ نہایت مؤدبانہ ہو گیا تھا۔

"ہاں اچھے سے جانتا ہوں میں تمہیں۔ میکال تم ایک نفسیاتی انسان بنتے جا رہے ہو۔ جانتے ہو تم یہ قتل اس لیے نہیں کر رہے کہ تم کسی کو انصاف دلوانا چاہ رہے ہو۔ تم یہ سب صرف اس لیے کر رہے ہو کیونکہ تم اپنے اندر کے گلٹ کو ختم نہیں کر پا رہے۔ میکال نے جھٹکے سے گردن اٹھائی۔

"ہاں میکال! تم صرف اس گلٹ کے ہاتھوں مجبور ہو۔ تم اپنے گلٹ کا سامنا نہیں کر پا رہے کہ ایک بہترین سائیکیٹریسٹ ہونے کے باوجود تم خود ہی اپنی بیوی کا علاج نہیں کر سکے۔ تمہاری بیوی تمہاری آنکھوں کے سامنے ٹراما اور خوف سے گھٹ گھٹ کر مر گئی مگر ملک

کا بہترین سائیکیٹریسٹ میکال شاہنواز کچھ نہ کرسکا۔" میکال کے قدم لرز سے گئے۔ گردن نفی میں ہلنے لگی۔

"یہ سب قتل تو صرف ایک دھوکہ ہے جو تم خود کو دے رہے ہو۔ تم کسی کو انصاف نہیں دلوا رہے تم صرف اپنے گلٹ کو تھپک کر سلانا چاہ رہے ہو۔ لیکن اب بس... اب بس کرو میکال۔ مان لو کہ جو ہوا وہ تمہاری قسمت تھی۔" میکال نے خشک ہوتے لبوں پر زبان پھیرتے پیچھے پڑی میز کا سہارا لیا۔

"تمہارے باپ کا جانا، تمہاری ماں کی تڑپ اور تمہارے بیوی اور بچے کی موت یہ سب لکھا تھا۔ اب صبر کرلو میکال اور میرے ساتھ چلو۔ نہیں تو تم اپنی جان سے بھی جاؤ گے۔"

"نہیں..." وہ منہ میں بڑبڑایا۔

"نہیں یہ سب اس شخص کا کیا دھرا ہے۔ اس شخص نے میرے باپ کو مجبور کیا تھا۔ میں اس شخص کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔" میکال کی آنکھیں سرخ ہونے لگی تھیں۔ چہرے پر عجیب تاثرات سجنے لگے۔

"تو اب تک تم نے اس شخص کو کیسے برداشت کر لیا۔ آخر پہلے کیوں نہیں مارا اسے ہاں! مان لو کہ تم صرف اپنا غصہ اور جنون ہوتا کرنا چاہتے ہو۔" ڈاکٹر مراد نے اس کے سینے پر زور زور سے انگلی سے دستک دی۔ وہ کھڑا انہیں دیکھتا رہا، آنکھوں میں تپش لیے، بے بسی کے ساتھ۔

"میکال سمریز بخاری اس شخص کو نہیں چھوڑے گا۔ اور صرف اسی کو نہیں اگر تم میرے ساتھ ابھی نہ چلے تو وہ تمہیں بھی نہیں چھوڑے گا۔ تم جانتے بھی ہو وہ کر کیا رہا ہے۔" ڈاکٹر مراد نے آگے بڑھ کر اسے گریبان سے پکڑتے جھنجھوڑا۔

"ہاں جانتا ہوں میں۔ وہ مجنوں بنا اپنی بیوی کی خدمت میں لگا ہے۔ کہنے کو تو انتقام لے گا۔ مگر ہمیشہ پہلی سیڑھی پر ہی گر جاتا ہے۔" میکال اونچی آواز میں چلایا۔ آخر میں اس کا لہجہ طنزیہ ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر مراد نے تلخی سے اس کا گریبان جھٹک کر چھوڑا۔ دو لمحے کیلئے وہ میکال کی لاعلمی پر پریشان ہو گئے تھے۔ انہوں نے ماتھا سہلاتے کچھ سوچا پھر جیب سے کچھ

نکال کر اس کی جانب پھینکا۔ وہ ایک کاغذ تھا۔ میکال نے پہلے انہیں پھر اس کاغذ کو دیکھا۔ وہ کاغذ اس کے سینے سے ٹکراتا زمین پر گر گیا۔ میکال نے جھک کر اسے اٹھایا۔

"کیا ہے یہ؟" وہ الجھن اور بیزاری سے بولا۔

"خود پڑھ کر دیکھو۔ دیکھو کہ تم نے طاقت کے نشے میں خود کو کس قدر لاعلم بنا لیا ہے۔"

میکال نے ایک نگاہ اس سفید کاغذ پر ڈالی۔ وہاں سیاہ روشنائی میں جگمگاتے الفاظ جیسے اس کے ہوش اڑا گئے۔

وہ چلتے چلتے سڑک کے عین بیچ و بیچ آ کر کھڑا ہو گیا۔ ایک جانب کو لگی پول لائٹ کی روشنی سیدھی اس پر پڑ رہی تھی۔ اس نے اپنی جیکٹ کی اندرونی جیب تھپتھپائی۔ لوہے کی ٹھنڈک نے اس کے پوروں کو چھوا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر وہ چیز باہر نکالی۔

پول لائٹ کی روشنی میں وہ شے روشن ہوئی۔ ایک ہاتھ سے ذرا سا بڑا چاندی رنگ کا چاقو سمریز کے ہاتھ میں تھا۔ آنسوؤں کا ایک گولہ اس کے حلق میں اٹکنے لگا۔ یہ وہی ہتھیار تھا جس سے

اس کے پیاروں کو مارا گیا تھا۔دل میں ٹیس سی اٹھی۔اس نے جبڑے بھینچ کر جیسے جذبات پر قابو پانا چاہا۔

شہد رنگ آنکھوں میں ایک لمحے کیلئے تکلیف ابھری تھی جسے وہ اگلے ہی لمحے چھپا گیا۔

سنجیدگی نے ایک بار پھر ڈیرے ڈال لیے۔

میکال پھٹی پھٹی نگاہوں سے اس کاغذ پر لکھے الفاظ پڑھتا چلا جا رہا تھا۔ جس پر لکھا تھا:

"تمہیں کیا لگتا ہے میں سمریز بخاری جس نے اپنی زندگی کے آٹھ سال اس مقصد کو دیے ہیں،وہ تم سب سے غافل ہو جائے گا۔غلط فہمی ہے تمہاری میکال شاہنواز۔ سمریز بخاری تم سے غافل نہیں وہ صرف تم سے کچھ فاصلے پر ہے۔وہ کیا ہے نا کہ شکار سے پہلے شکاری کو نشانہ تاننے کیلئے ذرا فاصلے پر جانا پڑتا ہے۔ تمہارا نشانہ میں تان چکا ہوں۔اب صرف ایک وار اور تمہیں گرنے سے کوئی نہیں بچا سکتا۔

تم نے سمریز بخاری کو اپنا ہتھیار سمجھا اب یہی ہتھیار تمہاری موت بن کر آئے گا۔ آہستہ آہستہ تمہاری جڑوں کو کاٹتے ہوئے میں بہت جلد تم تک پہنچوں گا۔ تب تک سکون کی چند مزید سانسیں لے لو۔

کیونکہ جس ظلم کا آغاز تم نے کیا، جو ڈھیروں زندگیاں برباد تم نے کیں میں ان سب کا بدلہ تم سے اور تمہارے ساتھ شامل ایک ایک شخص سے لوں گا۔ مجھ سے میرے ہی رشتے ختم کروا دیے تم نے مگر تم بھول گئے۔ بھول گئے کہ قتل کرنے کے بعد انسان کا دل مردہ اور روح بنجر ہو جاتی ہے۔ اب یہ مردہ دل اور بنجر روح والا تمارا پیادہ ایک ایک کر کے تمہارے ہر ساتھی کو گراتا جائے گا۔ امید ہے پہلا ڈیمو تم تک پہنچ گیا ہو گا۔"

اسی کے ساتھ کاغذ پر نیچے کو ایک نام لکھا تھا جس پر سرخ روشنائی سے کاٹا مارا گیا تھا۔ وہ نام پڑھ کر ایک لمحے کیلئے میکال کی سانس رک گئی۔ وہ نام اس کے قریبی بندے کا تھا۔ میکال کا پرسنل باڈی گارڈ جو گھر سے باہر ہر قدم پر اس کے ساتھ ہوتا تھا۔

سمریز کے سامنے ایک گاڑی آکر رکی، وہی پرانی مہران جو اکثر راہ چلتی ایک لڑکی کو لفٹ دینے کیلئے رک جاتی تھی۔ گاڑی کا شیشہ نیچے ہوا تو اندر بیٹھے شخص پر بھی پول لائٹ کی روشنی بکھری۔ سیاہ آنکھیں سمریز کی جانب ہی اٹھی ہوئی تھیں۔

"چلیں سر!" اس نے سنجیدگی سے پوچھا۔

سمریز سر ہلاتا دوسری طرف سے آکر گاڑی میں بیٹھا۔ تابش نے گاڑی سٹارٹ کی اور آگے بڑھا لے گیا۔

"سر ایک بار پھر سوچ لیں۔" گاڑی ڈرائیو کرتے اس نے سمریز کو مخاطب کیا۔ وہ تقریباً آدھا راستہ پار کر چکے تھے۔

"اب سوچنے کا وقت ختم ہو چکا ہے تابش۔ پچھلے آٹھ سال میں نے اس کیس کو سوچنے اور سمجھنے میں لگا دیے۔ اب صرف وار کرنے کا وقت ہے۔" اس کی آنکھوں میں تپش تھی۔ انتقام کے شعلے بھڑکتے صاف دکھائی دے رہے تھے۔

میکال نے اپنی تر ہوتی پیشانی ہاتھ کی پشت سے صاف کرتے موبائل اٹھایا اور اپنے اسی باڈی گارڈ کو کال ملائی۔ ایک رنگ، دوسری رنگ مگر کال نہ اٹھائی گئی۔

"کال اٹھاؤ فرمان... ڈیم اٹ!" اسے یکدم ہی گھبراہٹ ہونے لگی تھی۔

"وہ کال نہیں اٹھائے گا میکال۔ فرمان کا گھر جل چکا ہے۔ اور وہ بھی اسی آگ میں راکھ ہو گیا۔" ڈاکٹر مراد کے لہجے میں افسردگی تھی۔ میکال بے یقینی سے ان کی طرف بڑھا۔

"ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ سمریز اتنا ظالم نہیں۔ وہ بھلا اس کا گھر کیسے جلا سکتا ہے۔ فرمان کے بچے ابھی چھوٹے تھے۔ وہ کیسے ا نہیں..."

"فرمان کے بیوی بچے گھر پر نہیں تھے جب سمریز نے یہ کاروائی کی۔ وہ لوگ ایک ہفتے کی چھٹی منانے اپنی نانی کے گھر گئے تھے۔ سراج کے بعد فرمان ہی تھا جو ہمیشہ تمہارے ساتھ ہوتا تھا۔ اور صرف فرمان ہی نہیں وہ لوگ تمہارے اس ہیکر کو بھی موت کے گھاٹ اتار چکے ہیں۔ اگلی باری سراج کی ہو گی اور پھر تم اور شاہد۔ وہ ایک ایک کر کے سب کو ویسی ہی موت دے گا۔ جیسی تم لوگوں نے اس کے چچا اور بیوی کو دی۔" میکال کے ماتھا

سہلاتے ہاتھ یکدم تھم گئے۔ اس کے ذہن میں کچھ کلک ہوا تھا۔ ہاں ابھی سب ختم نہیں ہوا تھا۔

نہیں۔ وہ ایسا نہیں کر پائے گا۔ اس کا ذہن جلدی جلدی کام کرنے لگا۔ وہ اپنی الماری کی جانب بڑھا اور ڈھیروں کاغذات نکال کر زمین پر پھیلانے لگا۔

سمریز کیا مجھ تک پہنچے گا میں خود اسے اپنے پاس بلاؤں گا۔ سمریز ہمارے سے کبھی دو قدم آگے نہیں بڑھ سکتا۔ میں آج بھی اس سے دو قدم آگے ہوں۔ میں اس سے ہار نہیں سکتا۔

"میں ہر بار ان سے ہارا ہوں تابش۔ ہر بار مات کھائی ہے مگر اب وقت کی کایا پلٹنے کا وقت ہے۔ اب میں ان سے دو قدم آگے ہوں۔ اب ہار کی باری ان سب کی ہے۔" وہ انسان سڑک پر نگاہیں جمائے پورے اعتماد سے بولا۔ آواز میں ایک الگ ہی ٹھاٹھ تھی۔

"سر جیت ہماری ہی ہوگی۔ آپ کا انتقام پورا ہو گا لیکن..." اس نے گردن موڑ کر سمریز کو دیکھا۔

"لیکن سر اس ایک شخص کے مرنے سے آپ کا گھر برباد ہو سکتا ہے۔ صلہ بھابھی آپ کو کبھی معاف نہیں کریں گی۔" تابش نے اسے مطلع کرنا اپنا فرض سمجھا۔ سمریز کی نگاہوں میں ایک لمحے کیلئے تاثرات بدلے۔ وہاں ایک بار پھر تکلیف ابھری۔ اس نے آنکھیں بند کر کے گہری سانس بھری پھر دھیرے سے بولا۔

"اسے کبھی معلوم نہیں ہو گا۔ میں اسے کبھی معلوم نہیں ہونے دوں گا۔" وہ یقین سے کہہ رہا تھا مگر اندر کہیں اس کا اپنا دل بھی گھبراہٹ کا شکار تھا۔

"انتقام کی راہ بہت مشکل ہوتی ہے، یہ آپ سے آہستہ آہستہ ہر ساتھی چھین لیتی ہے۔ آخر میں صرف تنہائی رہ جاتی ہے۔ ایک بار پھر سوچ لیں سر۔ صرف اس ایک شخص کو چھوڑ دیں۔ باقی سب سے انتقام لیں گے ہم۔ صرف اس کو چھوڑ دیں۔ ویسے بھی اس کے پاس بچا ہی کیا ہے گنتی کے مزید چند سال!" تابش کی بات پر سمریز نے نفی میں سر ہلایا۔

"اسی کو تو نہیں چھوڑ سکتا۔ یہی تو ہے جس نے اس فساد کی بنیاد رکھی تھی۔ اس کا ختم ہونا ضروری ہے۔ اس نے میرے چچا کی زندگی چھینی، اسے کوئی حق نہ تھا کہ وہ ان سے ان کی

سانسیں چھینتا۔ اس لیے اب اسے بھی مزید سانسیں لینے کا کوئی حق نہیں۔ اس کا انت میں اپنے ہاتھوں سے کروں گا۔" وہ سختی سے دانت جمائے چبا چبا کر بولا تھا۔ تابش افسوس سے اسے دیکھ کر رہ گیا۔

"میں جانتا ہوں اب وہ کہاں جائے گا۔ مجھے معلوم ہے اگلی باری کس کی ہے۔ وہ سراج تک نہیں آئے گا، وہ اس وقت کہیں اور جائے گا۔ مگر میں اسے اس شخص تک پہنچنے نہیں دوں گا۔ میں اسے جیتنے نہیں دوں گا۔ اس شخص کو مارنے کا حق صرف مجھے ہے۔ میں سمریز کو اپنا یہ حق چھیننے نہیں دوں گا۔ اس شخص کا اختتام میرے ہاتھوں ہو گا۔" میکال آنکھوں میں کاٹھ لیے ڈاکٹر مراد سے کہہ رہا تھا۔ ڈاکٹر مراد نے اس کی بات پر سر پکڑ لیا۔

"میکال تم کونسی زبان سمجھو گے آخر؟ میں تمہیں یہاں سے لے جانے آیا ہوں اور تمہیں ابھی بھی انتقام کی پڑی ہے۔" ڈاکٹر مراد بھڑک اٹھے تھے۔

"اگر تمہیں یہ معلوم ہے کہ اب وہ کس تک جائے گا تو یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ اس کے بعد وہ تم تک آئے گا۔ اگلی باری تمہاری ہوگی میکال۔" ڈاکٹر مراد غصے سے اس کے کندھے جھنجھوڑ کر بولے۔

"تمہیں لگ رہا ہے کہ تم یہاں اس انڈر گراؤنڈ کاٹیج میں چھپ کر بیٹھے ہو تو وہ تم تک پہنچ نہیں سکے گا تو یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔ جب تک وہ تم لوگوں سے واقف نہیں تھا تب تک وہ مات کھاتا رہا تھا۔ اب وہ تم لوگوں سے باخوبی واقف ہے۔ اب وہ تم میں سے کسی ایک کو بھی نہیں چھوڑے گا۔ سمریز بخاری کی ذہانت کو انڈر اسٹیمیٹ مت کرو۔" وہ تنبیہہ کرنے والے لہجے میں اسے سمجھا رہے تھے مگر میکال انہیں نہیں سن رہا تھا۔ وہ صرف اپنا آگے کا لائحہ عمل سوچ رہا تھا۔

میکال تم آخر میری بات مان کیوں نہیں لیتے؟ وہ جیسے تھک گئے تھے اسے سمجھاتے سمجھاتے۔

"سمریز بخاری کچھ نہیں کر سکے گا۔ وہ مجھ پر کبھی وار نہیں کر سکے گا۔ میرے پاس ایک ایسا راز چھپا ہے جسے جاننے کیلئے اسے مجھ سے مات کھانی ہوگی۔ میرا یقین کریں وہ مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔" میکال نے بھی ان کے دونوں بازو تھام لیے تھے۔ وہ آنکھوں میں اعتماد لیے کہہ رہا تھا۔

"اگر تمہیں کچھ ہو گیا میکال تو میں قیامت کے دن تمہارے باپ کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ تم جانتے ہوں نا میں نے تمہیں بالکل اپنی اولاد کی طرح سمجھا ہے۔ میں تمہیں کھونا نہیں چاہتا یار۔" وہ بے بسی سے بولے تھے۔ آنکھوں میں موجود سختی یکدم ہی جیسے نمی میں بدلنے لگی تھی۔

"اگر آپ مجھے کھونا نہیں چاہتے تو میرا ساتھ دیں۔ آپ کو معلوم ہے میرا دم گھٹتا ہے ان لوگوں کو خوش دیکھ کر۔ ان لوگوں نے مجھ سے میرا سب کچھ چھین لیا۔ میں بالکل خالی ہاتھ ہوں۔ کچھ بھی باقی نہیں رہا۔ مجھے لگتا ہے میں اس تکلیف سے مر جاؤں گا"۔ میکال کے لہجے

Clubb of Quality Content

میں یکدم ہی بہت تکلیف امڈ آئی تھی۔ اس کا جسم ڈھیلا پڑنے لگا۔ وہ ڈاکٹر مراد کے بازوؤں میں جیسے تھک کر ڈھنے لگا تھا۔

"صرف آپ ہی ہیں جو میرا ساتھ دے سکتے ہیں، جو مجھے اس تکلیف سے نجات دلوا سکتے ہیں۔ مجھے مرنے سے بچا سکتے ہیں۔ مجھے بچا لیں۔" اس کی آنکھوں میں آنسو بھر گئے تھے۔ ڈاکٹر مراد کا دل پگھلنے لگا۔

"مجھے ایک آخری وار کر لینے دیں۔ میں آپ کے ساتھ واپس ہلفیتی چلا جاؤں گا، اس کے بعد میں کبھی واپس نہیں آؤں گا۔ بس ایک آخری بار۔" وہ رندھی ہوئی آواز میں منت کر رہا تھا۔ ڈاکٹر مراد نا چاہتے ہوئے بھی مان گئے۔

Clubb of Quality Content

oooooooooooooooooo

وہ پرانی مہران ایک بڑے سے گھر کے باہر آ کر رکی تھی۔ فرنٹ ڈور کھول کر وہ دونوں باہر نکلے۔ دونوں نے ہی اپنے چہرے سیاہ ماسک سے لگا لیے تھے۔ سمریز نے گاڑی سے ایک بیگ نکالا اور کندھے پر ڈالا۔ اس کے قدم اندر کی جانب تھے۔ گیٹ کے قریب پہنچ

کر سمریز نے کرسی پر بے سدھ پڑے چوکیدار پر ایک نظر ڈالی۔ہاتھ بڑھا کر اس کا چہرہ ہلکا سا ہلایا تو گردن دائیں جانب کو ڈھلک گئی۔اس کی گردن پر ہلکا سا نشان موجود تھا۔ایک نقطے کے برابر نشان جس کے آس پاس کی جگہ سرخ ہونے لگی تھی۔ سمریز نے ایک نگاہ زمین پر ڈالی۔ وہاں ایک چھوٹا سا ڈاٹ گرا ہوا تھا۔اس نے جھک کر وہ ڈاٹ اٹھا لیا۔

اس گارڈ کو ان دونوں نے ہی بے ہوش کیا تھا۔دور سے نشانہ تاک کر یہ ڈاٹ مارا گیا تھا بالکل ویسے ہی جیسے سمریز کو ہپنوٹائز کرنے کیلئے ڈاٹ مارا جاتا تھا۔اس نے وہ ڈاٹ اپنی جیب میں رکھا اور ایک نگاہ پیچھے کھڑے تابش پر ڈالی۔ وہ گاڑی کی ڈگی کھولے وہاں سے کچھ سامان نکال رہا تھا۔

سمریز کی نگاہ محسوس کر کے وہ رکا۔چاند کی ہلکی سی روشنی میں وہ سمریز کے چہرے پر ایک تناؤ دیکھ سکتا تھا۔اس سے پہلے کی گئی دونوں کاروائیوں میں ایک بار بھی سمریز کے چہرے پر پریشانی نہیں دکھی تھی۔ مگر یہاں معاملہ الگ تھا۔اس ایک شخص کے جانے سے اس

کی آباد ہوتی زندگی اجڑ سکتی تھی۔ تابش نے ٹھہر کر اسے دیکھا ساتھ ہی آنکھوں سے ایک بار پھر سوچنے کا مشورہ دیا۔

سمریز نے گلے کی گلٹی نگلی اور گہری سانس بھرتا مڑ گیا۔ اسے یہ کرنا ہی تھا۔ اس نے آٹھ سال اس مقصد کو دیے تھے اب عین وقت پر پیچھے نہیں ہٹ سکتا تھا۔

وہ آہستہ آہستہ قدم بڑھاتا اندر پہنچا۔ ہر جگہ اندھیرے کا راج تھا۔ اس نے کندھے پر لٹکے بیگ سے ایک ٹارچ نکالی اور روشن کی۔ وہ ٹارچ کی روشنی زمین پر گرا آگے بڑھتا گیا۔

چلتے چلتے وہ ایک کمرے کے باہر آ کر رکا۔ اپنی جیب سے پن نکالی اور اب وہ اس پن کو لاک میں ڈالے گھمانے لگا تھا۔ گھر کی خاموش فضا میں ارتعاش پیدا ہوا۔ اسی خاموشی میں شاہد بخاری کے کہے جملے اس کے کانوں میں گونجنے لگے۔

"مجھے عالمگیر کی موت کا بہت دکھ ہوا۔ میری اس سے کبھی بنی نہیں تھی مگر پھر بھی وہ میرے لیے بھائیوں کی طرح تھا۔" ایک کلک... وہ ماہرانہ انداز میں پن لاک میں گھماتا جا رہا تھا۔

"میں نے عالمگیر سے بہت منت کی تھی مگر وہ میری بات نہیں مانا۔ اسے ایک بار میرا یقین کرنا چاہیے تھا۔ اس نے مجھے اپنے آفس میں ذلیل کیا تھا، اس نے میرا یقین نہیں کیا تھا، اس کی وجہ سے میری ماں مر گئی تھی۔ میں بدلہ لینے کیلئے دیوانہ ہو رہا تھا۔ میں اسے مارنا نہیں چاہتا تھا مگر مجھے یہ کرنا پڑا تھا۔ میرے نفس نے مجھ سے یہ سب کروادیا تھا۔" دوسرا کلک...

شاہد بخاری نے یہ سب اقرار خود اس کے سامنے کیا تھا۔ ہسپتال کے کوریڈور میں جب صلہ نے انہیں جانے کا کہا تھا تو انہوں نے پریشانی میں سمریز سے سب کہہ ڈالا تھا۔ وہ اس سے ہمدردی حاصل کرنا چاہتے تھے وہ چاہتے تھے کہ بس کسی طرح کوئی ان کی بیٹی کو سمجھائے۔ مگر وہ بھول گئے تھے کہ سامنے کھڑا شخص سمریز ہے وہی جو اس کھیل میں سب سے زیادہ گھائل ہوا تھا۔

"وہ کہتی ہے کہ میں نے تمہیں نقصان پہنچایا ہے۔ میں تم سے معافی مانگتا ہوں۔ میں نے تم سے تمہارے چچا کو چھینا ہے نا تو میں تم سے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگتا ہوں سمریز۔ کہو گے تو

پیر بھی پکڑ لوں گا مگر تم صلہ کو سمجھاؤ۔ تم اس سے کہو کہ اپنے باپ کو اس عمر میں تنہا نہ چھوڑے۔ میں تمہارے ہر نقصان کی بھرپائی کر دوں گا۔ چاہو گے تو اپنا سارا بزنس بھی تمہارے نام کر دوں گا۔ بس تم صلہ کو مناؤ۔" وہ ہاتھ جوڑ کر اس کے سامنے سسک رہے تھے مگر وہ پتھر کی مورت بنا کھڑا رہا۔ شاہد کی کسی بات کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ اسے صرف خون کے بدلے خون چاہیے تھا۔ کوئی مال، کوئی دولت اس کے کام کی نہیں تھی۔ اسے بس اپنے پیاروں کے خون کا بدلہ چاہیے تھا۔ اور آج وہ آپہنچا تھا۔ خون کے بدلے خون لینے۔ تبھی ہوا تیسرا کلک اور لاک کھل گیا۔ دروازہ کھولنے کی یہ تکنیک انہیں پولیس ٹریننگ میں سیکھائی گئی تھی۔

وہ دروازے کا ناب گھماتا اندر داخل ہوا۔ اندر نائٹ بلب کی ہلکی زرد روشنی موجود تھی۔ وہ آہستگی سے قدم بڑھاتا شاہد بخاری کے بستر تک آیا۔ وہ گہری نیند میں ڈوبے تھے مگر پریشانی اور تناؤ ان کے چہرے پر بکھرا تھا۔ وہ کافی کمزور دکھ رہے تھے، پہلے کی طرح تر و تازہ چہرہ اب مرجھا سا گیا تھا۔

سمریز نے کندھے پر لٹکا بیگ نیچے رکھا۔ شہد رنگ آنکھیں اب بیگ میں مزید کچھ تلاش رہی تھیں۔ چند لمحوں بعد اس نے بیگ سے مطلوبہ چیز نکالی۔ وہ چھوٹی سی ڈیوائس تھی۔ اس نے اون کا بٹن دبایا تو کمرے میں ہلکا سا موسیقی گونج اٹھا۔ وہی بیلا چاؤ کا ہلکا ہلکا سا موسیقی جو اس کہانی سے جڑے ہر شخص کا دل ڈوبا دیتا تھا۔

اس نے سکون سے آگے بڑھ کر ایک بڑی سی رسی نکالی۔ وہ رسی ہلکی گیلی تھی۔ اس رسی کے بیگ سے نکلتے ہی فضاء میں کیورسین کی خوشبو پھیل گئی۔ وہ موسیقی اور فضاء میں پھیلی خوشبو جیسے ہی شاہد بخاری کے نتھنوں تک پہنچی ان کی نیند میں خلل ڈلا۔

سمریز اب پرسکون انداز میں اس رسی سے شاہد بخاری کے ہاتھ اور پیر باندھ رہا تھا۔ شاہد بخاری کے حواس جیسے ہی بیدار ہوئے وہ چونک کر اٹھنے لگے۔ اگلے ہی پل ان کا دل ڈوب سا گیا۔ کہا تھا نا اس موسیقی سے دل ڈوب جاتا تھا۔

"کون... کون ہو تم؟" وہ ہڑبڑا سے گئے تھے۔ انہوں نے سمریز کے ماسک کے پیچھے چھپے چہرے کو دیکھتے ہوئے پوچھا، ڈر کے مارے ان کا لہجہ لڑکھڑا سا گیا تھا۔

"تمہاری موت..." سمریز کے رسی باندھتے ہاتھ ایک لمحے کیلئے تھمے۔ اس نے نگاہ اٹھا کر شاہد کی ڈری سہمی ہوئی آنکھوں میں دیکھا۔ دل میں چبھن سی ہوئی۔ کیا اس کے پیارے چچا بھی یوں ہی سہمے ہوں گے؟

"تمہاری موت، شاہد بخاری!" وہ گہری کاٹھ دار آواز میں دوبارہ بولا۔ ساتھ ہی اس نے پوری طاقت سے رسی کی ناٹ کسّی۔

اس کی آواز اور انتقام کی آگ میں بھڑکتی اس کی شہد رنگ آنکھیں پہچاننے میں شاہد کو ایک لمحہ بھی نہیں لگا تھا۔

"سمریز!" ان کے لب بے یقینی سے ہلے۔

"ہاں! ہاں! وہی سمریز جس کا سب سے زیادہ نقصان تم نے کیا۔ وہی سمریز جس کی زندگی کو گھن چکر بنا کر برباد تم نے کیا۔" وہ یکدم اپنے چہرے کا سیاہ ماسک اتارتا چلا یا تھا۔ ڈر کے مارے شاہد بخاری کا جسم لرزنے لگا تھا۔ موت کا خوف چاروں طرف سے اسے گھیرنے لگا۔

سمریز بڑھے تنفس کے ساتھ انہیں گھورتا چلا گیا۔

ناولز کلب
Clubb of Quality Content!

”مجھے... مجھے معاف کر دو۔ میں... میں نے وہ سب عالمگیر سے...“

”چچا جان کا نام بھی مت لینا اپنی زبان سے، نہیں تو یہ زبان کاٹ کر پھینک دوں گا۔“ وہ یکدم ہی جیب سے خنجر نکال کر ان کے چہرے کی جانب جھکا۔ لہجے میں اتنی کاٹ تھی کہ شاہد بخاری کو اپنے رونگھٹے کھڑے ہوتے محسوس ہوئے۔ چاقو ان کی ٹھوڑی تلے رکھے وہ تیش کے ساتھ انہیں دیکھ رہا تھا۔ شاہد کا جسم پسینے سے بھیگنے لگا تھا۔ خوف کے مارے انہیں ٹھنڈے پسینے آرہے تھے۔

”سمجھ آئی تمہیں... اپنی ناپاک اور منافق زبان سے میرے چچا کا نام بھی مت لینا۔“ اس کی آنکھیں غیر انسانی حد تک بے رحم لگ رہی تھیں۔ شاہد نے سر کے مارے تھوک نگلا۔ سمریز آہستہ سے پیچھے ہوا۔ نگاہیں اسی پر گاڑ رکھی تھیں۔

سمریز نے جھک کر بیگ میں سے ایک پلاسٹک بیگ نکالا۔ وہ بیگ سیاہ گلاب کی پتیوں سے بھرا ہوا تھا۔ اب وہ ان پتیوں کو زمین پر بکھیر نے لگا۔

novelsclubb@gmail
www.novelsclubb.com
IG: @novelsclubb

"یوں ہی مروایا تھا نا تم نے انہیں۔ یوں ہی ہر طرف پتیاں بکھری تھیں، ایسے ہی انہیں رسیوں میں جکڑا تھا۔" وہ یوں ہی گلاب کی پتیاں بکھیرتے ہوئے ان سے مخاطب ہوا۔ شاہد اسے گردن پھیر کر کانپتے وجود سے دیکھ رہے تھے۔

"پر میں نے اسے اس کی غلطی..."

"اپنی زبان بند رکھو۔" شاہد نے ٹوٹے لہجے میں کہنا چاہا تھا کہ وہ پوری قوت سے چلایا۔ شاہد اسے بے یقین و بے بس نگاہوں سے دیکھتے رہ گئے۔ انہیں اس وقت سمریز سے شدید خوف محسوس ہو رہا تھا۔ آج پہلی بار پرسکون رہنے والا سمریز بخاری کسی وحشی روپ میں ان کے سامنے آیا تھا۔

"میں یہاں تمہاری کوئی بکواس سننے نہیں آیا۔ تم نے ظلم کیا تھا شاہد بخاری اور اب میں یہاں تمہارے ظلموں کا فیصلہ سنانے آیا ہوں۔ وہ فیصلہ جو کوئی عدالت، کوئی جیوری، کبھی نہ سناتی، وہ فیصلہ میں خود تمہیں سناؤں گا۔" وہ بے رحم انداز میں کہتا دوبارہ پتیاں بکھیرنے لگا۔ فضاء میں بیلا چاؤ کی دھن کے ساتھ ساتھ گلاب کی خوشبو بھی بکھر گئی تھی۔

Clubb of Quality Content

”جانتے ہو شاہد جب میں پہلی بار تم سے ملا تھا تب ہی مجھے تم سے منفی قسم کی وائبز آئی تھیں۔ تمہارے الفاظ، تمہارا انداز ہر چیز جھوٹی لگتی تھی۔ تب میں سمجھ نہیں پاتا تھا۔“ گلاب کی دلسوز خوشبو اس وقت کسی کا بھی دل دہلانے کیلئے کافی تھی۔ گلاب کی خوشبو اس کمرے میں کافور کی بو کی طرح پھیلے جا رہی تھی۔

”پھر جب میں تمہارے پاس بزنس کا مسلہ لے کر آیا تھا تو مجھے معلوم ہوا کہ تم ایک منافق شخص ہو۔ تم میرے منہ پر میرے ہمدرد بنے رہتے تھے اور وقت آنے پر مجھے ہی لوٹنے لگے تھے۔ تب مجھے لگا کہ شاید ان منفی وائبز کی وجہ یہی تھی۔ تمہارا منافق چہرہ۔“ اب وہ سکون سے کہتا اس کے بستر پر پتیاں بکھیرنے لگا۔ اس کے ہر قدم، ہر آہٹ کے ساتھ شاہد کی جان حلق کو آ رہی تھی۔

”تم نے میری ہی کمپنی میں مجھے ملازمت پر رکھا۔ تم نے میرے بزنس سے اپنا فائدہ اٹھایا لیکن میں نے سب برداشت کیا۔ میں نے صحیح موقعے کے انتظار میں تمہاری ہر منافقت برداشت کی۔“ بستر پر پتیاں بکھیر کر اس نے پلاسٹک بیگ زمین پر پھینک دیا۔

”اور پھر وہ صحیح وقت آیا بھی، جب تم روتے ہوئے اپنی بیٹی کا رشتہ کے کر آئے تھے۔ جب تم نے مجھے لالچ دے کر اپنی بیٹی سے شادی کرنے پر فورس کیا تھا۔“ شاہد کو وہ وقت یاد آیا جب وہ سمریز سے منت کرنے اس کے گھر گئے تھے۔

انہوں نے سمریز کے سامنے ایک آفر رکھی تھی اور وہ یہ کہ وہ صلہ کا ہاتھ تھام لے اور شاہد بدلے میں اسے ڈی ایس پی کی پوسٹ دلوائیں گے۔ تا کہ وہ اپنے چچا کا کیس حل کر سکے۔ یہ سب ثناء کی موت کے بعد ہوا تھا۔ شاہد سے صلہ کی ٹوٹی ہوئی حالت دیکھی نا جاتی تھی۔ صلہ مریم کی بتائی گئی باتوں سے خود کو بہت بہتر بنا چکی تھی مگر اندر کہیں یک طرفہ محبت کا روگ اسے کھائے جا رہا تھا۔ سمریز نے ان کی آفر میں اپنی بھی ایک شرط رکھی اور وہ یہ کہ شاہد کو اس کا بزنس پورے شئیرز کے ساتھ واپس کرنا ہو گا۔ شاہد فوراً مان گئے تھے۔ سمریز نے صلہ سے شادی اسی شرط پر کی تھی۔ صلہ اس شرط سے باخوبی واقف تھی۔

"میں نے تم سے اپنا سب کچھ واپس لے لیا تھا۔ مجھے لگا تھا میں تمہاری اس منفی انرجی سے بچ کر نکل آیا ہوں مگر نہیں... شاید بخاری تم تو میری زندگی کا سب سے بڑا ناسور رہے ہو۔ لیکن آج..." وہ قدم قدم بڑھاتا عین ان کے سرہانے آکر ٹھیرا۔

"آج میں اس ناسور کو جڑ سے ختم کردوں گا۔" وہ گردن ڈھلکائے، جبڑے بھینچے سختی سے بولا۔

"نہیں سمریز... نہیں ایسا مت کرو۔" شاہد بخاری فریاد کرنے لگے۔ وہ رسیوں میں جکڑے اپنے ہاتھ پیر ہلاتے خود کو بچانے کی تگ و دو کر رہے تھے۔

سمریز نے جیب سے خنجر نکالا۔ خنجر پر انگلی پھیرتے ہوئے اس نے شاہد کی جانب دیکھا۔

"میں نے کہا تھا نا کہ میں اپنے وقت کا انتظار کروں گا، تو آج وہ وقت آپہنچا ہے۔ آج تمہارے گھر کی رونق میرے گھر پر ہے۔" اس کا اشارہ صلہ کی جانب تھا۔

"اور تمہاری زندگی میرے ہاتھ میں۔ اسے کہتے ہیں آپ ان مال سود سمیت واپس لینا۔"

اسی کے ساتھ اس نے خنجر دونوں ہاتھوں میں تھام کر شاہد کے سینے میں گھونپ دیا۔

○○○○○○○○○○○○○○○○

جاری ہے

اگلی قسط اگلے ماہ انشاءاللہ!

ناولز کلب
Clubb of Quality Content!

مزید بہترین ناول/افسانے/آرٹیکل/مختصر کہانیاں اور معیاری شاعری پڑھنے کے لئے

نیچے دیئے گئے لنک پر کلک کریں۔

شکریہ!

www.novelsclubb.com

ناولز کلب
Clubb of Quality Content!

اگر آپ میں لکھنے کی صلاحیت ہے اور آپ اپنا لکھا ہوا دنیا تک پہنچانا چاہتے ہیں، مگر آپ کے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے۔۔ تو ہم سے رابطہ کریں۔

ہماری ٹیم آپ کو قدم قدم پر رہنمائی فراہم کرے گی اور آپ کی لکھی ہوئی تحریر دنیا تک لائے گی۔

آپ اپنا لکھا ہوا ناول، افسانہ، شاعری، ناولٹ، کالم یا آرٹیکل پوسٹ کروانا چاہتے ہیں تو اپنا مسودہ ہمیں ورڈ فائل یا ٹیکسٹ فارم میں میل کریں

novelsclubb@gmail.com

آپ ہمارے فیس بک، انسٹا پیج اور واٹس ایپ کے ذریعے بھی ہم سے رابطہ کر سکتے ہیں۔

FB PAGE:

NOVELSCLUBB

INSTA:

NOVELSCLUBB

WHATSAPP:

03257121842